قرآن کریم اور سنت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۷۷ شمارہ: ۸
شعبان المعظم: ۱۴۳۵ھ - جولائی: ۲۰۱۴ء
قیمت فی شمارہ: ۳۰ روپے، زرِ سالانہ: ۳۵۰ روپے

مدیر / مدیر مسئول
مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر

نائب مدیر
مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مدیر معاون
مولانا محمد اعجاز مصطفی

ناظم
مولانا فضل حق یوسفی

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ''بینات''، جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن
کراچی 74800، پوسٹ بکس نمبر 3465
فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 7-397-101900 برانچ کوڈ: 0816
مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی 74800

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ، ناروے، ویسٹ انڈیز وغیرہ: 35 امریکی ڈالر
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط، بحرین، عمان، ایران، انڈیا وغیرہ: 27 امریکی ڈالر
بنگلہ دیش: 25 امریکی ڈالر

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147
فیکس: +92-21-34919531

Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر **مطبع:** ایجوکیشنل پریس **طابع:** فیروز زکی

www.banuri.edu.pk

فہرست مضامین

بصائر وعبر

ذرائع ابلاغ کا کردار اور اس کی حدود!	۳	محمد اعجاز مصطفیٰ

مقالات ومضامین

اسلام دینِ رحمت ہے!	۹	محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ
تعلیم کے فروغ میں علمائے کرام کی ذمہ داریاں	۱۵	مفتی رفیق احمدؒ بالاکوٹی
عہدِ رسالت میں صحابہ کرامؓ کی فقہی تربیت (قسط:۲)	۲۱	مولانا ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی
عالمِ عربی کے معروف عالم شیخ البانیؒ شعیب ارنؤوط کی نظر میں	۳۰	مولانا محمد یاسر عبداللہ
فریضۂ زکاۃ اور اس کی ادائیگی (قسط:۱)	۴۳	مفتی محمد راشد ڈسکوی
الفاظِ طلاق سے متعلقہ اُصولوں کی تفہیم وتشریح (قسط:۸)	۴۸	مفتی شعیب عالم

یادِ رفتگاں

آہ! شیخ الحدیث مولانا قاری صدرالدینؒ	۵۶	مولانا زبیر احمد صدیقی

دار الافتاء

ایک کرنسی کی دوسری کرنسی کے بدلہ خرید وفروخت اور قرض کا حکم!	۵۹	ادارہ

نقد ونظر

	۶۱	ادارہ

www.banuri.edu.pk

ذرائع ابلاغ کا کردار اور اس کی حدود!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہٖ الذین اصطفیٰ

آج کا مسلمان‘ انجام سے بے نیاز، طلبِ مجہول اور ہوسِ زر، زن، زمین میں اس قدر منہمک اور فریفتہ ہوگیا ہے کہ خیر وشر، اچھائی و برائی، صحیح وغلط اور جائز وناجائز کی تمام حدود وقیود اس کے لیے بے معنی اور بے مقصد ہوکر رہ گئی ہیں۔

اس برق رفتاری اور خدا فراموش زندگی گزارنے میں وہ اپنی دانست میں ترقی کی منازل طے کرتا ہوا معراجِ دنیا پر اپنے آپ کو تصور اور باور کررہا ہے، حالانکہ اس سے وہ اپنی اصلیت اور اپنے فرائض کو فراموش کرچکا ہے۔ اپنے خالق ومالک اور اپنے رب کی ہدایات اور سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو ترک کرکے اُنہیں طاقِ نسیان کے حوالے کرچکا ہے، جس کے نتیجے میں وہ دنیا وآخرت کے مفاد کو سوچے سمجھے بغیر ہر نئی صدا اور آواز پر لبیک کہتا چلا جارہا ہے، چاہے وہ جدید صدا اور آواز دنیا میں اس کے لیے ذلت وبربادی اور آخرت میں لعنت وہلاکت کا موجب وسبب ہی کیوں نہ ہو۔

یوں لگتا ہے شاید انہیں اپنا مخلوق ہونا تسلیم ہی نہیں، اس لیے کہ اگر انہیں اپنا بندہ اور مخلوق ہونا تسلیم ہوتا تو کم ازکم غیروں کی صدا پر لبیک کہہ کر اپنے خالق کے احکام سے اس طرح بے اعتنائی اور اعراض نہ برتتے۔ دینِ اسلام، پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم، اسلامی تعلیمات، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اہل بیت عظام رضی اللہ عنہم، اسلامی اقدار وروایات کی اس قدر اور اس طرح بے توقیری نہ کرتے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میڈیا اور ذرائع ابلاغ میں چھپے اسلام دشمن عناصر نے مسلمانوں کو مغرب پرستی کی خوش نما بھٹی میں جھونک دیا ہے، جس کے نتیجے میں معاشرہ نہ صرف یہ کہ اسلامیات سے عاری اور دور ہوتا

www.banuri.edu.pk

جارہا ہے، بلکہ دینِ اسلام کے حقائق اور عقائد کو بھی مغرب کی عینک سے دیکھتے ہوئے' اسبابِ تنزل کو باعثِ کامیابی اور معائب کو محاسن سمجھا جانے لگا ہے۔

انہیں ذرائع ابلاغ ہی کی کارستانی ہے کہ عورت جو کل تک گھر کی زینت اور حیا وشرم کا مجسمہ تھی، آج وہی گھر کو خیر باد کہہ کر دفاتر و بازار سے گزر کر ٹی وی اسکرین کی زینت اور اشتہارات کا محل اور مورد بن چکی ہے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ وہ بچی جو کل تک مشرقیت کی برکت سے مارے شرم وحیا کے اپنے باپ کے سامنے بے محابا آنے سے گریزاں تھی، افسوس کہ آج وہی بچی نہ صرف بے باک ہے، بلکہ چادر وچار دیواری کو پھلانگ کر مذہبی بندھنوں سے آزاد، اپنے آپ کو مغرب کی تہذیب میں رنگ کر نہ صرف مطمئن بلکہ اس بے حیائی وہوا باختگی پر نازاں ہے۔

....

رسائل، جرائد، ڈائجسٹ، ناول، اخبارات، اشتہارات، سائن بورڈز، ریڈیو، ٹی وی، کیبل نیٹ ورک، انٹرنیٹ، ٹیلیفون، موبائل فون، وغیرہ، یہ وہ ذرائع اور آلات ہیں جنہیں پرنٹ میڈیا، الیکٹرونک میڈیا اور ذرائع ابلاغ کے نام سے جانا اور موسوم کیا جاتا ہے۔

آج کا دور میڈیا کا دور ہے اور میڈیا کو کسی ملک، سلطنت اور حکومت کا اہم ستون قرار دیا جاتا ہے۔ حکومتوں کے بننے اور بگڑنے میں میڈیا کا اہم رول اور بڑا کردار تصور کیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ میڈیا جس کو چاہے بامِ عروج تک پہنچا دے اور جسے چاہے بیچ چوراہے ذلیل اور رسوا کردے۔

بین الاقوامی طور پر اس وقت پورے میڈیا پر مغرب کا تسلط اور اس کے کارندوں کا قبضہ ہے۔ یہ لوگ میڈیا کے ذریعہ وہی پروگرام نشر کرتے ہیں جو حیا سوز، تہذیب وتمدن کو پامال اور بے ایمانی اور بے راہ روی کو فروغ دینے اور پروان چڑھانے والے ہوں، اس کے ساتھ ساتھ انسانیت کو ذہنی غلامی، ڈر، خوف، بزدلی، بے ہمتی، بے غیرتی، بے شرمی، جھوٹ، فریب، لوٹ کھسوٹ، چوری، ڈکیتی، مار دھاڑ کے نت نئے طریقے اور راستے میڈیا کے ذریعہ بتائے اور یہ زہریلے انجکشن اُنہیں اِسی کے ذریعہ لگائے جاتے ہیں۔

یہ میڈیا کی اس محنت ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہر انسان مرد ہو یا زن، جوان ہو یا بوڑھا، چھوٹا ہو یا بڑا، سب ہی کسی نہ کسی اعتبار سے میڈیا سے متأثر اور مرعوب نظر آتے ہیں، اس کی ہر خبر کو ''سچا'' اور اس کے ہر پروگرام کو ''اچھا'' سمجھ کر ٹھنڈے پیٹوں قبول کر لیتے ہیں۔ اسی کا شاخسانہ ہے کہ آئے روز میڈیا میں اسلام کے خلاف کسی نہ کسی پیرائے میں طعنہ زنی کی جاتی ہے، اسلامی اقدار کی تضحیک کی جاتی ہے، اسلامی اقدار وروایات کو پامال کیا جاتا ہے، اسلام پر عمل کرنے والوں پر اشاروں اور کنایوں میں پھبتیاں کسی جاتی ہیں، لیکن مجال ہے کہ اربابِ اقتدار واختیار کے ذمہ داران افراد اور خفیہ ادارے ان پر کوئی قدغن لگائیں یا ان سے کوئی باز پرس کریں۔

یہی میڈیا تھا جو اپنے آقاؤں اور حکومتی اہل کاروں سے مراعات اور بڑے بڑے

اشتہارات وصول کرکے حدود آرڈی نینس کی دھجیاں بکھیر رہا تھا۔ ’’ذرا سوچئے‘‘ کے عنوان پر اربوں روپے کے اشتہارات لے کر ان کی مہم کو گھر گھر پہنچا رہا تھا اور سیدھے سادے مسلمانوں کے دل و دماغ کو حدود آرڈی نینس کے خلاف آمادۂ بغاوت کیا اور اس وقت ۷؍مئی ۲۰۰۶ء کو اشتہار میں لکھا کہ: ’’ذرا سوچئے! کیونکہ سوچنا گناہ نہیں‘‘۔ پھر ۸؍مئی ۲۰۰۶ء کو لکھا: ’’کیونکہ سوچ ہی انسان کو آدمی بناتی ہے‘‘۔ پھر ۱۴؍مئی کی اشاعت میں یہ لکھا کہ: ’’ذرا سوچئے! جیو کی ایسی کاوش ہے جو ہمیں ان مسائل پر سوچنے کی جرأت دیتی ہے‘‘۔ پھر ۲۵؍مئی ۲۰۰۶ء کے ادارتی نوٹ میں لکھا کہ: ’’ذرا سوچئے‘‘ کی تحریک ایسے معاشرہ میں عقل واستدلال کا غلبہ قائم کرنے کا مثبت اقدام ہے، جہاں عقائد کے حوالے سے بھی سوچنے پر غیر اعلانیہ پابندی ہو۔‘‘ (روزنامہ جنگ کراچی، ۲۵؍مئی ۲۰۰۶ء)

گویا یہ اعلان تھا کہ حدود آرڈی نینس میں ترمیم وتبدیلی کے بعد اگلا ہدف یا اگلا قدم عقائد کی تبدیلی پر سوچنے کا ہوگا۔ یہ تمام باتیں ماہنامہ بینات صفر المظفر ۱۴۳۲ھ مطابق فروری ۲۰۱۱ء کے شمارہ میں ’’وفاقی شرعی عدالت کا مستحسن اقدام‘‘ کے تحت لکھی گئی تھیں۔

کیا کوئی مسلم دانشور اور باشعور شخص یہ بات سوچ سکتا ہے کہ مال وزر کی چمک دمک میڈیا کے ذمہ داران اور مالکان کو اتنا اندھا بنا سکتی ہے کہ وہ باہوش وحواس عقائد کی تبدیلی کی راہ ہموار کریں اور مسلمانوں کو محض عقل کے بل بوتے پر عیسائیت، قادیانیت یا ہندومت کا عقیدہ اور نظریہ قبول کرنے کی سعی اور راہ دکھائیں، نعوذ باللّٰہ من ذلک۔

یہی میڈیا تھا جس کی محنت اور کوشش سے رسوائے زمانہ فلم ’’خدا کے لیے‘‘ پاکستان میں چلائی گئی، اس کے علاوہ اسی میڈیا کی کاوشوں سے یہودی نظریات کی ترجمان اور توہین انبیاءؑ پر مشتمل فلم ’’دی میسج‘‘ پاکستانیوں کو دکھائی گئی اور اس سے میڈیا کی اتنی جرأت بڑھ گئی کہ صحافتی قوانین اور صحافتی ضابطۂ اخلاق بالائے طاق رکھ کر ملکی آئین وملکی سلامتی کے ذمہ دار اداروں پر ہاتھ صاف ہونے لگے اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن کریم، سنت نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہل بیت عظام رضی اللہ عنہم کی شان میں گستاخی کا ارتکاب بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر ہوگیا۔ اس پر اگرچہ توبہ اور معافی مانگی گئی ہے، لیکن اگر اس سے قبل میڈیا ملکی سلامتی کے اداروں کی کردار کشی کی بنا پر زیر عتاب نہ ہوتا تو اس گستاخی کو بھی پہلے کی طرح بڑے آرام اور پرسکون خاموشی سے ہضم اور برداشت کرلیا جاتا، لیکن اس بار ایسا نہ ہوسکا۔

ٹھیک ہے کہ میڈیا کو آزاد ہونا چاہیے، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اپنی تہذیب، اپنا کلچر، اپنے دین اور قرآن وسنت کی جو حدود ہیں، ان کی پرواہ نہ کی جائے، کیونکہ کوئی بھی ادارہ یا نظام خواہ نجی ہو یا سرکاری، حدود وقیود کی رعایت اور اصول وضوابط کی پابندی کیے بغیر ہرگز نہیں چل سکتا۔ آج حالت یہ ہے کہ کم فہمی اور دینی تعلیمات سے ناآشنائی کی بنا پر ٹی وی اینکر سطحی موضوعات کو لیتا ہے۔ کج بحثی،

www.banuri.edu.pk

ذاتی دل چسپی اور پسند وناپسند کی بنا پر بہت ساری دینی حدود کی پامالی کا سبب اور ذریعہ بن بیٹھتا ہے۔ اس لیے میڈیا میں ہر صحافی، اینکر اور میزبان کے لیے ضروری ہے کہ کم ازکم انسانی اخلاقیات سے متصف ہو، اس کے اندر قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ مضبوط ہو، عزم وحوصلہ، صبر وثبات اور استقلال ہو، تحمل وبرداشت ہو، ہمت اور شجاعت ہو، مستعدی اور جفاکشی ہو، اپنے مقصدِ اسلام کا عشق اور اس کے لیے ہر لالچ، ہر دباؤ، ہر ترغیب کو پائے حقارت سے جھٹلانے والا ہو۔ اسلامی اقدار کے معاملہ میں حزم واحتیاط کا خوگر اور معاملہ فہمی وتدبر سے آشنا ہو، حالات کو سمجھنے اور اسلام کے مطابق ان کو ڈھالنے اور مناسب تدبیر کرنے کی اس میں قابلیت ہو، اپنے جذبات وخواہشات اور ہیجانات پر قابو پانے والا ہو۔

اس لیے کہ خودداری، راست بازی، دینی حمیت، اسلامی غیرت، امانت، اعتدال، شائستگی، طہارت ونظافت، قلب ونظر کی پاکیزگی اور ذہن ونفس کا انضباط، وہ انسانی خصائل اور فضائل ہیں جن پر ایک اسلامی معاشرہ کی اساس قائم ہے۔ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تمام محنتوں، کوششوں، کاوشوں اور دوڑ دھوپ کا مقصد وحید اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی کا حصول ہو، خواہ اس میں کتنے ہی خطرات، نقصانات اور مشکلات کیوں نہ حائل ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ اسلام انسان کو خودغرضی، نفسانیت، ظلم، بے حیائی، بے راہ روی سے روکتا ہے۔ اسلام انسان کو خداترسی، تقویٰ وپرہیزگاری اور حق پرستی کا درس دیتا ہے، اُسے تمام مخلوقات کے لیے رحیم، کریم، فیاض، ہمدرد، امین، بے غرض، خیرخواہ، بے لوث، منصف اور صادق وراست باز بناتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی تعلیم ہے کہ انسان کو بھلائی کا دروازہ کھولنے والا اور برائی کا دروازہ بند کرنے والا ہونا چاہیے۔

اخبارات، ٹی وی اور میڈیا کیا کچھ کر رہے ہیں یا ان میں بگاڑ کس طرح در آیا؟ اپنی طرف سے کچھ لکھنے کی بجائے روزنامہ جنگ کراچی کے صحافی جناب شاہین صہبائی صاحب کے کالم ''یہ اجتماعی خودکشی کب تک'' کے زیرعنوان کچھ اقتباسات پیش خدمت ہیں:

> ''جب سے پاکستان میں درجنوں کے حساب سے چینل آئے ہیں، آزادی بہت بڑھ گئی ہے، مگر ذمہ داری کا فقدان ہے۔ کچھ چینل (میں کسی کا نام نہیں لوں گا، پڑھنے والے خود اندازہ لگالیں) صحافتی بیک گراؤنڈ سے آئے اور کچھ دیکھا دیکھی پیسے کے زور پر۔ کچھ کاروباری لوگوں کو محسوس ہوا کہ ان کا کاروبار ترقی کرے گا یا ان کی چوری کو کوئی پکڑنے کی ہمت نہیں کرے گا، اگر وہ بھی میڈیا کے مالک بن گئے۔ کچھ پیسے والے لوگ جب میڈیا سے پریشان ہونا شروع ہوئے تو بدلے لینے خود میدان میں کود پڑے۔ یعنی پاکستان میں سوائے دوچار گروپس کے باقی سب لوگ چمک دمک اور بڑھتی ہوئی میڈیا کی طاقت دیکھ کر مالک، اخبارنویس اور میڈیا اینکرز بن بیٹھے۔ کچھ نے خوب بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے، جہاں سے پلاٹ، زمین، نوکری اور کوئی فائدہ مل سکا ایک سیکنڈ کی دیر نہیں لگائی۔ کچھ فوجیوں کی

آمریت میں وزیر اور مشیر بنے، کوئی سیاست دانوں کے ساتھ مل کر شامل باجا ہوگیا، کوئی سفیر بن گیا اور کوئی امیر۔ غرض میڈیا کے راستے جس کی جتنی بن پڑی اس کو بے دریغ استعمال کیا۔ کچھ کہانیاں ایسی بھی ہیں کہ کچھ دن کے لیے صحافت کی سیڑھی استعمال کر کے لوگ مزے اُڑاتے رہے اور جب وہ دن بیت گئے تو واپس صحافت میں آ کر سب کی ماں بہن شروع کر دی یا پھر سیڑھی کے نیچے سے یہ اوپر جانے کی کوشش۔ اس بھاگ دوڑ میں جائز اور ناجائز مال کمانا ایک اہم ترین عنصر رہا۔ اخبار اور TV کے مالکان جائز آمدنی کے ساتھ ساتھ خاص مراعات بھی لیتے رہے.........خواتین کی بھرمار اور پھر شادی بیاہ کی رسومات دن رات کا خیال کیے بغیر ایسے نشر ہونے لگیں جیسے یہی ہمارا دینی اور ثقافتی ورثہ ہے۔ مزید آگے چلئے تو جرم کی داستانیں عام ہونا شروع ہوئیں اور کچھ چینل پولیس اور دوسرے اداروں کے فرائض انجام دینے لگے۔ یہ سارے شتر بے مہار ہوتے گئے اور کسی نے نہ روکا، روکنے والے یا تو بکے ہوئے تھے یا دبے ہوئے ضرورت مند، سیاسی یا مالی طور پر۔ پھر اس لڑائی میں وہ مقام آ گیا کہ ہم ایک دوسرے پر پل پڑے اور آج کی صورتحال یہ ہے کہ پورا میڈیا اجتماعی خودکشی کی طرف دوڑ رہا ہے۔'' (روزنامہ جنگ، کراچی، بروز پیر، ۱۹؍مئی ۲۰۱۴ء)

اب جبکہ میڈیا سے ہر ایک طبقہ، ہر حکومت اور ہر ادارہ کو زخم لگ چکے ہیں، بلکہ خود میڈیا بھی حکومتوں کی طرف سے عائد کی گئی پابندیوں کو کئی ایک بار جھیل چکا ہے تو ان سب کو سوچنا چاہیے اور اپنا قبلہ اور سمت درست کر لینی چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کہلائی جانے والی چیزیں اکثر و بیشتر بہت سارے گناہوں کا مجموعہ ہیں، حکومت کو چاہیے کہ ان کی روک تھام کرے، لیکن اگر وہ اپنے آپ کو اتنا مجبور پاتی ہے تو اُسے چاہیے کہ کم از کم ایسے پروگراموں اور فلموں پر پابندی لگائے جو اسلام، قرآن، انبیاء کرام علیہم السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اہل بیت عظام رضی اللہ عنہم، اسلامی تعلیمات، اسلامی اقدار اور ملکی سلامتی اور نظریۂ پاکستان کے خلاف ہوں اور اگر کوئی اس کا مرتکب ہو تو سخت سے سخت قوانین بنا کر ان کو آئینی شکنجہ میں کس دیا جائے۔

علمائے کرام کو چاہیے کہ وہ بھی بیدار رہیں، دین کے خلاف لکھنے، بولنے اور عوام الناس کو ورغلانے والوں کو انہیں کے انداز میں جواب دیں، فتنہ پروروں کے فتنوں کو سمجھیں اور ان کے ازالہ اور حل کے لیے ہر ممکن تدابیر اختیار کریں اور عوام الناس کو باور کرائیں کہ یہ فتنوں کا دور ہے، ہر فتنہ پرور اور اس کے فتنہ سے ہوشیار رہیں اور ایسے لوگوں کی بروقت علمائے کرام کو اطلاع دیں۔ ایک امام مسجد اور خطیب جہاں مسجد کا امام اور خطیب ہوتا ہے، وہاں اس علاقے میں وہ مسلمانوں کے دین و ایمان کا محافظ بھی ہوتا ہے، اس لیے اسے چاہیے کہ منبر و محراب سے مغالطہ آمیز اور غلط نظریات کے ابطال کی طرف مسلمانوں کی راہنمائی کرے۔

اسی طرح عوام کو چاہیے کہ ان دجالی آلات سے نہ صرف یہ کہ اپنے آپ کو بچائیں، بلکہ اپنی اولاد اور نئی نسل کو ان کے خطرناک نتائج سے باخبر رکھیں اور حتی الامکان ان سے دور رہنے کی کوشش اور تلقین کریں۔ اس لیے کہ گھروں میں چین وسکون اور امن واطمینان انہیں کی وجہ سے غارت ہوگیا ہے۔ بچیوں کے معاشقے، ان کے گھروں سے فرار کے واقعات، اور گھر والوں سے چھپ کر پسند کی شادیوں کی کثرت، عریانی، فحاشی اور بے پردگی کو عروج ان ملعون پروگراموں اور آلات کی بدولت ملا ہے۔

ہماری ہمدردانہ گزارش ہے کہ میڈیا اپنی پرانی روش بدلے اور اسلام سے بغاوت وعداوت کا معاندانہ رویہ ترک کرکے اسلامی تعلیمات کو اجاگر کرے۔ عریانی، فحاشی، بے دینی اور بے حیائی پر مبنی پروگرام، حیا سوز فلمیں اور ایمان کش مکالمے خصوصاً ملحدین، منکرینِ قرآن وسنت اور جدیدیت زدہ لوگوں کو میڈیا سے دور کریں اور ان کے پروگرامات اور ٹاک شوز پر مکمل پابندی لگائیں، جیسا کہ قرآن کریم کو کلام الٰہی ماننے سے انکار پر ایک ملحدہ کو مصری خاتون اینکر نے اپنے پروگرام سے اٹھادیا اور اُسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر اپنے اسٹوڈیو سے نکل جانے کا حکم دے دیا، اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:

''معروف مصری خاتون ٹی وی اینکر ریہام سعید نے ملحدانہ نظریات کی حامل خاتون اسکالر کو قرآن کریم کی توہین کرنے پر پروگرام کے دوران اسٹوڈیو سے نکال باہر کیا۔ القدس العربی کے مطابق نام نہاد مذہبی اسکالر ڈاکٹر نہی محمود نے ''نہار'' ٹی وی کے پروگرام میں گفتگو کے دوران بعض قرآنی احکامات کو غیر اہم ثابت کرنے پر زور دیتے ہوئے قرآن کریم کو کلام باری تعالیٰ ماننے سے انکار کیا اور کہا کہ (نعوذ باللہ) قرآن کریم حضرت محمد ﷺ کی ذاتی تصنیف ہے، جس پر پروگرام کی میزبانی کرنے والی خاتون اینکر ریہام سعید نے نام نہاد اسکالر خاتون کو مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر فوراً پروگرام سے اُٹھ جانے کا حکم دے دیا۔ ریہام سعید نے ملعونہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم جھوٹ، فریب اور جاہلانہ خیالات کے ذریعہ اسلامی معاشرے کو غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کررہی ہو، لہٰذا پاگل پن کا مظاہرہ چھوڑ کر اسٹوڈیو سے نکل جاؤ۔ میزبان کے اس غیر متوقع ردعمل پر ملعونہ ڈاکٹر نہی محمود کے اوسان خطا ہوگئے اور میزبان سے اپنا ادب ملحوظ رکھنے کا کہتی رہی، تاہم ریہام سعید نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے اسٹوڈیو سے نکال دیا''۔ (روزنامہ اسلام، کراچی، بروز ہفتہ، ۱۷/مئی ۲۰۱۴ء)

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو ہدایت کاملہ عطا فرمائے اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہ سیدنا محمد وعلٰی آلہ وصحبہ أجمعین

☆☆☆

اسلام دینِ رحمت ہے!

محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

بلاشبہ اسلام دنیا میں دینِ رحمت ہے۔ تمام ادیانِ الٰہیہ سماویہ میں رحمت بن کر آیا ہے۔ پوری انسانیت کی ہمدردی کا علمبردار ہے۔ اس کے دامن میں رأفت ورحمت اور اُخوت وشفقت کے وہ پھول ہیں جن سے مشامِ عالم معطر ہے۔ اسلام نے دنیا کو ہمدردی ومحبت کا درس دیا ہے۔ اسلام آنے کے بعد تمام اربابِ ادیان اپنے اپنے مذہب میں اصلاح کرنے پر مجبور ہوئے کہ اسلام کے آفتاب عالمتاب کے بعد وہ اس قابل نہ تھے کہ دنیا کے سامنے منہ دکھا سکیں، حدیث نبوی:

''لایبقیٰ بیت وبر ولامدر إلا أدخله اللّٰه الإسلامَ بعِز عزيزٍ وذُل ذليلٍ''۔

''کوئی خیمہ اور مٹی کا مکان باقی نہیں رہے گا، مگر اللہ تعالیٰ وہاں اسلام کو داخل کردے گا، کسی معزز کی عزت اور ذلیل کی ذلت کے ساتھ''۔

کا اشارہ اس مضمون کی طرف بھی ہے کہ ہر ہر گھر میں اسلام پہنچا اور ہر ہر مذہب نے اس کی خوبیوں سے فائدہ اٹھایا۔

اسلام جانوروں پر بھی رحم کرنے کی تعلیم دیتا ہے

اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے یہ بتلایا کہ ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر بھی جنت حاصل کی جاسکتی ہے اور ایک بلی کو ناحق ایذا دینے سے انسان جہنم میں پہنچ سکتا ہے۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو جانوروں پر بھی رحم سکھاتا ہے اور جانور ذبح کرنے کے لیے چھری تیز کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو دنیا میں مظلوم بننے کو ذریعۂ نجات سمجھتا ہے اور ناقابلِ برداشت تکالیف ومصائب میں صبر وحوصلہ کی تلقین کرتا ہے اور صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر وثواب کی بشارت سناتا ہے: ''إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ''۔ انتقام لینے کا حکم اس وقت دیتا ہے جب پانی سر سے گزر جائے اور ظلم حد سے بڑھ جائے، مگر انتقام کی بھی غیر محدود اجازت نہیں دیتا، بلکہ یہ شرط عائد کرتا ہے کہ انتقام

www.banuri.edu.pk

ظلم کے مماثل ہو، اس سے متجاوز نہ ہو، ارشاد ہے: ''فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ''یعنی جتنا ظلم تم پر کیا گیا بس اتنا ہی انتقام لے لو۔ اور ''جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا '' برائی کی سزا اتنی ہی برائی ہے اور اس کے باوجود بھی اعلان فرمایا: ''فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ '' کہ جو شخص درگزر کرے اور درستگی و اصلاح کی فکر کرے تو حق تعالیٰ ہی اجر عطا فرمائے گا۔

اسلام کا قانونِ رحمت وعدل

اسلام صرف اس وقت تلوار اٹھانے کا حکم دیتا ہے کہ جب اصلاح کے راستے بند ہو جاتے ہیں، تمام معاشرہ کے تباہ ہونے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے اور کوئی توقع خیر کی باقی نہیں رہتی، ہر طرف سے مایوسی ہی مایوسی ہوتی ہے، اس وقت شر و فساد سے عالمِ انسانیت کو بچانے کے لیے تلوار کا حکم دیتا ہے اور پھر بھی یہ اعلان کرتا ہے کہ بچوں کو بچاؤ، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل مت کرو، عبادت گاہوں میں بیٹھے ہوئے عبادت گزاروں سے درگزر کرو۔ کیا موجودہ تہذیب کے مدعی خواہ وہ فرانس ہو یا برطانیہ، امریکہ ہو یا جرمنی، روس ہو یا چین، اسلام کے قانونِ رحمت وعدل کی نظیر پیش کر سکتے ہیں؟ اسلام کی رواداری وانسانی ہمدردی کی کوئی مثال وہاں مل سکتی ہے؟

اسلامی غزوات پر اعتراض کرنے والوں کے روح فرسا کارنامے

دنیا کی جنگِ عظیم دوم نے کیا کیا تباہی نہیں مچائی؟ دو ہزار میل لمبا اور چار سو میل چوڑا میدانِ کار زار گرم ہوا، تیس ہزار ٹینک اور پچاس ہزار ہوائی جہاز انسانی خون کی ہولی کھیلنے کے لیے اُمڈ آئے۔ ۶ ربرس تک انسانیت کی وہ مسلسل تباہی ہوتی رہی جس کی نظیر تاریخِ ظلم واستبداد میں نہیں مل سکتی اور جس کے سامنے چنگیز و ہلاکو شرمندہ ہیں۔ دس دس، بارہ بارہ گھنٹے مسلسل ہوش ربا بمباری ہوتی رہی، سینکڑوں مربع میل میں نہ کوئی معصوم بچہ محفوظ رہا، نہ کوئی ضعیف وناتواں بوڑھا، بچے، عورتیں اور بے گناہ حیوانات تمام کے تمام ہلاک ہوئے۔ پہلے ہٹلر و ہملر و گوبلز و میسولینی نے یہ کردار ادا کیا، پھر برطانیہ کے چرچل اور امریکہ نے اس درندگی کا ثبوت دیا، تقریباً تین کروڑ نسلِ انسانی تباہ ہوئی اور لاکھوں عورتیں بیوہ ہوگئیں۔ اسٹالن نے کتنے لاکھوں، بلکہ کروڑوں انسانوں کو صرف اپنے عقیدے کمیونزم کی مخالفت کی وجہ سے تہِ تیغ کیا، روس نے سمرقند و بخارا میں کیا کیا؟ فرانس نے الجزائر میں کیا کیا؟ ان مہذب بھیڑیوں اور انسان نما درندوں نے دنیا میں کیا کیا؟ اور کیا کر رہے ہیں؟ نسلِ انسانی کو تباہ و برباد کرنے کے لیے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے ذخائر جمع کرنے والوں نے پہلے کیا کچھ نہیں کیا؟ اور آئندہ کیا کچھ نہیں کریں گے؟ کیا ان درندوں کے دلوں میں رحمت وانسانیت کا ایک شمّہ بھی موجود ہے؟ کیا ان کو شرم نہیں آتی کہ اسلام کے مسئلہ جہاد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات پر اعتراض کرتے ہیں؟ جبکہ ان میں دس سال کے عرصہ میں فریقین کے چندسو

اَفراد سے زیادہ قتل نہیں ہوئے۔ کفر کی یہ غیر منصفانہ دھاندلی کتنی عجیب ہے کہ خود تو مظلوم اور بے گناہ انسانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے کیا کیا ظلم کر رہے ہیں اور حکومتوں کے تختے اُلٹنے اور طرح طرح کے انقلابات لانے کے لیے کیا کیا ستم ڈھا رہے ہیں اور کیا کیا روح فرسا واقعات کرتے رہتے ہیں، لیکن اگر اسلام عدل قائم کرنے کے لیے کسی بدترین مجرم کو قصاص کے طور پر قتل یا زنا جیسے قبیح جرم کے مرتکب کی سنگساری کا حکم دے تو تمام کافر چیخ اٹھتے ہیں کہ یہ عدل وانسانیت کے خلاف ہے۔ اگر عقول یہاں تک مسخ ہو جائیں تو پھر جنوں کا کیا علاج؟ کیا آج کل عدالتیں پھانسی کی سزائیں نہیں دیتیں؟ صد حیف کہ اسلام کے نام سے سزا ہو تو جرم ہے اور اگر غیر اسلامی عدالت سے سزا ہو تو عینِ انصاف ہے:

بریں عقل و دانش بباید گریست

اسلام میں تو کفار کی قسمیں ہیں: ۱-حربی کافر، ۲- ذمی کافر، ۳-مستأمن کافر، ۴-مرتد کافر۔ سب کے الگ الگ احکام ہیں، پھر اسی طرح مملکتوں کی اقسام ہیں: ۱- دار الاسلام، ۲- دار الحرب، ۳- دار الامان۔ سب کے علیحدہ علیحدہ شرعی احکام ہیں، بسا اوقات ان احکام کو نہ سمجھنے کی وجہ سے شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ جو کافر میدانِ جنگ میں مسلمانوں سے معرکہ آرا ہوں، ان کے ساتھ اسلام کا رویہ نسبتاً شدت آمیز ہے۔ اسی طرح وہ کافر جو اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں اور سازشیں کرنے میں مصروف ہوں، ان کے حق میں اسلام کا رویہ سخت ہے اور بلاشبہ اس موقع پر شدت وسختی ہی سراپا حکمت اور عینِ مصلحت ہے، جب ایک مسلمان زانی کے بارے میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَلَاتَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ''۔ (النور:۲)

''اور دیکھو! زانی مرد وعورت پر اللہ کے دین کا حکم نافذ کرتے وقت تمہیں ان پر ترس نہیں آنا چاہیے''۔

تو مفسد کفار کے حق میں شفقت وروا داری کیونکر جائز ہوسکتی ہے؟ جب کبارِ صحابہؓ اور بدری صحابہؓ کے بارے میں مکمل مقاطعہ کا حکم شرعاً واجب ہوسکتا ہے تو کفار ومرتدین کے بارے میں اگر صحیح سزا کی قدرت نہ ہو تو بدرجہ مجبوری ان کے ساتھ مقاطعہ کیوں اسلامی اصول کے خلاف ہے؟ درحقیقت اسلام کی تمام سزائیں نہ صرف یہ کہ عدل وانصاف کے فطری اصول پر مبنی ہیں، بلکہ خود مجرم کے حق میں عینِ رحمت اور سراپا حکمت ہیں، تاکہ اُسے غور وفکر کا موقع ملے اور اسلام جیسی نعمت سے محروم ہو کر ابد الآباد تک عذابِ الٰہی میں گرفتار نہ ہو۔ اصل اسلام ہی وہ دینِ سماوی ہے جس نے جرم وسزا کے درمیان فطری توازن قائم کر کے انسانیت پر عظیم الشان احسان کیا ہے۔ جو لوگ جرائم پیشہ مفسدین اور کفار ومرتدین کے ساتھ معمولی سختی پر چین بجبیں ہو جاتے ہیں، ان کے نزدیک گویا مسلمانوں کے ساتھ ظلم کرنا تو قابلِ برداشت ہے، لیکن کافروں اور مرتدوں کے ساتھ سختی کرنا اسلامی عدل وانصاف کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کو فرضی جرائم پر مادر زاد عریاں کرنا، اُنہیں سخت سے سخت سزائیں دینا اور ان سے انسانیت سوز سلوک کرنا تو ان کے نزدیک بالکل انصاف ہے، لیکن موذی محارب کافر کو معمولی سزا دینا بھی اسلام کے

خلاف ہے، یعنی اسلام، مسلمانوں کو اتنی بھی اجازت نہیں دیتا کہ وہ بددین موذیوں سے قطع تعلق ہی کرلیں؟ نہ معلوم عقل وانصاف اور دین ودیانت کا جنازہ کیوں نکل گیا؟ موذی کافر کے ساتھ رحمدلی اور بے گناہ مسلمان کے ساتھ بے رحمی یہ کہاں کا فلسفہ ہے؟ کچھ محسوس ہوتا ہے کہ ایمان کا نور دلوں سے نکل چکا ہے اور کفر کی عظمت ایسی چھا گئی ہے کہ حقائق کی تمیز مشکل ہوگئی ہے۔

اسلام کا دستور

''دینِ اسلام یا شریعتِ اسلامیہ'' نام ہے اس عالمگیر نظامِ انسانیت کا جس میں تکمیلِ انسانیت کے کسی گوشہ کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ خالق سے رشتہ ہو یا مخلوق سے اور وہ بھی شخصی زندگی سے متعلق ہو یا اجتماعی زندگی سے، غرض عبادات ہوں یا معاملات، معیشت ومعاشرت ہو یا احوال واخلاق واعمال، ان سب کے لیے ایک علمی دستور اور ایک مقصد ونصب العین ہے، دینِ اسلام کا علمی دستور قرآنِ حکیم اور مقصود رضائے الٰہی ہے۔

قرآنِ حکیم انسانیت کی تکمیل چاہتا ہے اور اس کے لیے اس نے اسلام کے بنیادی اصول واحکام اور اساسی اغراض ومقاصد انتہائی محیر العقول اور معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ واضح کردیئے ہیں۔ ان مقاصد واحکام کے سلسلۂ بیان میں وہ مظاہرِ فطرت اور آثارِ قدرت کو بھی اگر بیان کرتا ہے تو اس کا مقصود بھی یہی ہے کہ انسان کے فکری اور اعتقادی پہلوؤں کی تکمیل کی جائے۔ اگر وہ تاریخی حقائق بیان کرتا ہے تو اس کی غرض بھی یہی ہوتی ہے کہ ان عبرت انگیز وقائع تکوینی اور آیات الٰہیہ سے انسانی بصیرت واعتبار کی تربیت وتکمیل کی جائے۔ اگر احکامِ الٰہیہ کا ذکر ہوگا تو اس سے بھی یہی مراد ہوگی کہ اشرف المخلوقات انسان کو اکرم المخلوقات بنانے کی تدبیر ہوجائے۔ ذات وصفات کی توحید وکمال کا بیان ہو یا تذکیر وموعظت کی داستان، قانونِ عدل وانصاف کی تنظیم وتفصیل ہو یا اصول واحکام کی تمہید وانضباط، ان سب ہی سے انسان کو انسانیت کی معراجِ کمال تک پہنچانا مقصود ہے۔

قرآن کریم نہ تاریخی کتاب ہے کہ محض واقعات کی تفصیلات ہی بیان کرتا رہے اور نہ طبیعی نوامیس کی تفصیل وبیان پر مشتمل کتابِ طبیعیات ہے کہ محض علمی اور ذہنی عیاشی کے افسانوں میں وقت ضائع کرے، وہ تاریخ کی روح پیش کرتا ہے اور طبیعیات کے عقلی وفکری نتائج بیان کرتا ہے جن سے توحیدِ الٰہی، خَلق وربوبیت کے حقائق انسان کے دل ودماغ میں پیوست ہوں اور روح کو پاکیزگی حاصل ہو، تاکہ وہ نظامِ عالم میں خلیفۃ اللہ کے منصب اعلیٰ کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل بن جائے۔ قرآن اگر کائنات میں غور کرنے کی دعوت دیتا ہے تو اس کی غرض وغایت یہی ہوتی ہے کہ انسانی ذہن وفکر کے سامنے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا راستہ کھل جائے اور اس غور وفکر کے بصیرت آموز نتائج سے ایمان بالغیب کی تائید اور پرورش ہو، اس لیے کہ ان حقائقِ کونیہ اور حقائق الٰہیہ میں غور وخوض سے ایمان قوی ہوگا، وہ

ان کی طرف محض علم وفن کی حیثیت سے کبھی دعوت نہیں دیتا کہ محض فن کو مقصد بنالیا جائے۔

قرآن کے بعض جدید مفسرین کو اس سلسلہ میں بڑی غلط فہمی ہوئی ہے، انہوں نے ان موضوعات میں قرآنی مباحث کی تفسیر اور ان مباحث کی غایت وغرض بیان کرنے میں بڑے غلو سے کام لیا ہے اور یہ حقیقت ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی ہے کہ قرآن اگر ان طبیعیات میں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے تو اس کا مقصد بھی معرفتِ الٰہی تک پہنچنا ہے اور اگر کسی جگہ ان طبیعی وسائل کو دائرۂ عمل میں لانے کی طرف متوجہ کرتا ہے تو اس کی غرض وغایت یہی ہوتی ہے کہ ان وسائل کو خدمتِ خلق کا ذریعہ بنایا جائے، صرف مال ودولت اور ثروت کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ ظاہر ہے کہ ذات وصفاتِ الٰہی کے بحرِ بیکراں میں شناوری کا صرف یہی ایک راستہ ہے کہ انسان ان حقائق میں غور کرے، تاکہ اس وادی میں اس کی فکر ونظر کی صلاحیتیں زیادہ وسیع ہوں اور اس کے سامنے معرفتِ الٰہیہ کے نئے نئے ابواب کھلیں اور جب اس طرح قلب وروح کی تربیت ہوجائے اور انسانیت کا صحیح شعور بیدار ہوجائے تو عملی دائرہ کا صحیح مقصد بھی خود بخود متعین ہوجاتا ہے۔

☆☆☆

www.banuri.edu.pk

www.banuri.edu.pk

تعلیم کے فروغ میں علمائے کرام کی ذمہ داریاں

مفتی رفیق احمد، بالاکوٹی

مؤرخہ ۲۲ /اپریل ۲۰۱۴ء کو ہوٹل کراؤن پلازہ، اسلام آباد میں ایک روزہ سیمینار منعقد ہوا، جس کا عنوان تھا: ''پاکستان میں تعلیم کے فروغ میں حائل رکاوٹیں اور ہماری ذمہ داریاں'' اس بڑے عنوان کو کئی ذیلی عناوین میں تقسیم کر کے ملک کے مختلف اہل علم وارباب دانش کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ جامعہ کی طرف سے اس مجلس میں راقم الحروف (رفیق احمد) کو شرکت کا موقع ملا۔ ذیلی عناوین میں ''تعلیمی سال کا آغاز: تعلیم کے فروغ میں علمائے کرام کی ذمہ داریاں'' کے موضوع پر راقم نے اپنی تحریر کا خلاصہ پیش کیا، جو نذرِ قارئین کیا جاتا ہے۔

اسلام میں تعلیم کی اہمیت

تعلیم، سیکھنے، سکھانے اور علم کو منتقل کرنے کا عمل ہے، قرآن میں متعدد مقامات پر مختلف پیرایوں میں تعلیم کا تذکرہ آیا ہے، کہیں ''اقرأ'' کے لفظ سے اس عظیم منصب کو بیان کیا گیا اور کہیں ''عَلَّمَ، **یعلم، یعلمون**'' جیسے لفظوں سے دہرایا گیا۔ احادیث مبارکہ میں بھی اس کا تذکرہ بے شمار مقامات پر موجود ہے، ذخیرۂ احادیث میں ''**کتاب العلم**'' کے عنوان سے حدیث کی ہر کتاب میں علم کی فضیلت، تحصیلِ علم کے فضائل اور ترغیبات کا بیان موجود ہے۔

تعلیم (سکھانا) منصبِ الٰہی ہے، جو آغازِ انسانیت سے ہی شروع ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو علم عطا کر کے فرشتوں پر افضلیت اور فوقیت واضح کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت اور علم کو لازم وملزوم قرار دیا۔ جب تک آسمانی وحی کا سلسلہ قائم رہا، تعلیم کا سلسلہ اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان، پھر انبیاء علیہم السلام کے واسطے سے عام سماج میں بھی قائم رہا۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی ہی ''اقرأ'' (پڑھیے) کا حکم لے کر اتری۔ چھ سو سال کے طویل وقفے کے بعد بھٹکتی انسانیت کے لیے خدا کے نئے پیغام کا آغاز کلمۂ ''اقرأ'' کے ساتھ ہوا، یہ پہلی وحی واضح اشارہ تھی کہ کائنات میں ہر سو ہر نوع پھیلی ہوئی ظلمتوں سے نجات کا ذریعہ نورِ علم ہی ہوسکتا ہے۔ (۱) اسی نورِ علم کے ذریعہ انسانیت کی تکمیل اور تشکیل ممکن ہوگی، چنانچہ نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی وترجیحی ذمہ داریوں میں ترویج علم اور تعلیم تھی۔ (۲)

www.banuri.edu.pk

تعلیم کا مقصد

جب تعلیم کے موضوع پر بات ہو تو تعلیم وتعلم کا بنیادی مقصد بھی سامنے رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہر شئے اپنے مقصد اور غرض کی بنا پر عظیم اور برتر سمجھی جاتی ہے۔ تعلیم وتعلم کا مقصد بھی اپنی غرض وغایت کی بنا پر اہمیت وعظمت کا حامل ہے۔ تعلیم کے بنیادی مقاصد چار ہیں: ۱- خداشناسی، ۲- نفس دانی، ۳- ناخواندگی کو خواندگی میں تبدیل کرنا، ۴- معاشرتی ضرورتوں سے آگاہی اور اس کے لیے منصوبہ بندی کرنا۔

علم کا حقیقی مصداق، حکم اور قدیم وجدید کی تفریق

علم کا حقیقی مصداق وحی الٰہی کا علم ہے۔ عرفی استعمال میں علم ''مطلق دانست وآگاہی'' کو کہتے ہیں۔ حلال وحرام، طہارت ونجاست اور فرائض کا علم فرض عین ہے، جب کہ دین کی تفصیلات کا بقدرِ استطاعت علم حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔ دیگر علوم اپنی ضرورت کے اعتبار سے واجب یا مستحب ہیں، بلکہ بعض علوم حرام بھی ہیں، جیسے: علم سحر، علم رمل، علم نجوم، وغیرہ۔ علوم میں قدیم وجدید کی تفریق کرنا درست نہیں، بلکہ یہ سب ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ البتہ اس بات کا احساس اور اعتراف بھی کیا جانا چاہیے کہ انسانی زندگی مختلف شعبوں میں تقسیم ہے، رجالِ کار کے درمیان تقسیمِ کار کے قدرتی فارمولے کے پیشِ نظر زندگی کے تمام شعبوں کے لوگ ایک دوسرے کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ (۳)

معاشرے کے لیے علمائے دین کی ضرورت، ان کا کردار اور حیثیت

علمائے کرام' انبیائے کرام علیہم السلام کے وارث ہیں۔ علمائے کرام کے بغیر اسلامی معاشرہ اپنے رب اور اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتا۔ علمائے کرام کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر ان کی آواز کو اسلامی معاشرہ کی سب سے مؤثر آواز سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان سب سے زیادہ اپنے علمائے کرام کی بات مانتے ہیں، کیوں کہ امت میں ان کی حیثیت وہی ہے جو اپنے زمانہ میں انبیائے علیہم السلام کی تھی، البتہ انبیاء علیہم السلام صاحبِ وحی وشارع تھے، جب کہ علمائے کرام شارحِ وحی ہیں۔ (۴)

نئے تعلیمی سال کے حوالے سے علما کی ذمہ داریاں

فروغِ علم اور ترویجِ تعلیم انسانی معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے، اس ضرورت کی بجاآوری حاکمِ وقت سے رعایا کے ادنیٰ فرد تک ہر ایک کی ذمہ داری ہے، ہر ایک کا اپنی اپنی حیثیت اور دائرۂ عمل میں اس کے لیے محنت وکوشش کرنا' معاشرتی ضرورت اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔ (۵) علمائے کرام چونکہ معاشرے کی مؤثر آواز کے حامل ہیں، اس لیے اس حوالے سے ان کی ذمہ داری بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔ علمائے کرام کی چند اہم ذمہ داریاں درج ذیل ہیں:

پہلی ذمہ داری: فکری ذہن سازی

علمائے دین جس دینی شعبے سے وابستہ ہوں، وہ اپنے فورم سے عوام میں شعور وآگاہی کو موضوع

بنائیں۔ تعلیم کی اہمیت، فروغِ علم کی ضرورت، اس کے فوائد وثمرات اور جہالت وتعلیم سے دوری کے نقصانات سے آگاہی کو مشن بنائیں۔ نیز جدید وقدیم، عصری ودینی علوم کی تفریق پر مبنی نظریات کی حدود وقیود بیان کی جائیں، مثلاً: مسلمان بحیثیت انسان انسانی معاشرے کا فرد ہے، مسلمان رہتے ہوئے وہ معاشرتی ضروریات پر مشتمل عصری تقاضوں اور ان تقاضوں تک رسائی دینے والے علوم ووسائل سے مستغنی نہیں رہ سکتا، اس لیے علمائے دین کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرہ میں قائم اس تفریقی سوچ کی اصلاح کرتے ہوئے دینی وعصری علوم کے تقابل کو تلازم باور کرائیں اور ہر ایک طبقہ کی اپنی جگہ ضرورت کا جائز مقام سمجھائیں، کیوں کہ مسلمان معاشرے کے لیے جس طرح ایک اچھے عالم دین کا ہونا ناگزیر ہے، اسی طرح ماہر ڈاکٹر وانجینئر، باکردار افسر اور امانت دار اور دیانت دار تاجر، صنعت کار اور سرمایہ کار بھی اس معاشرہ کی ضرورت ہیں۔ تعلیمی میدان میں قدم رکھے بغیر کارگاہِ عالم کے یہ مختلف ستون کیسے میسر آئیں گے؟

دوسری ذمہ داری: فروغِ علم کی راہ میں حائل رکاوٹیں اور مشکلات کی تشخیص وآگاہی

فروغِ علم کی راہ میں رکاوٹوں اور مشکلات کا تعلق چار جہتی ہوسکتا ہے:

۱- والدین کی غفلت ولا پرواہی

بچوں کی علمی محرومی کا بنیادی سبب والدین کی غفلت اور لاپرواہی ہے، والدین کو بتانا ہوگا کہ اولاد اللہ تعالیٰ کی نہ صرف ایک نعمت بلکہ امانت بھی ہے، اس امانت کے تقاضے پورے کرنا اور حقوق ادا کرنا والدین پر شرعاً فرض ہے، کیوں کہ والدین پر بچوں کے تین بنیادی حقوق ہیں:

۱:......بہترین نام رکھنا ۲:......اچھی تعلیم وتربیت کرنا ۳:......مناسب جگہ شادی کرنا (۶)

والدین کو ادراک کرایا جائے کہ اولاد کی نعمت سے مطلوبہ فوائد' تعلیم وتربیت کے بغیر ممکن نہیں۔ والدین اپنے حقوق کی فہرست بنانے، بتانے اور جتلانے سے قبل بچوں کے مختصر سے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کریں، بصورتِ دیگر ایک بچے کی جہالت اور تربیت سے محرومی اس کے والدین اور معاشرے کے لیے رحمت کی بجائے زحمت کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

۲- بچوں کی بے توجہی وبے رغبتی

بچوں تک علم نہ پہنچنے کا ایک سبب بچے کی فطری بے رغبتی اور لاابالی پن بھی ہے۔ بچوں میں تعلیم کا شوق اور رغبت کے لیے اُنہیں مستقل مجالس ومحافل کے ذریعہ علم کے فضائل وفوائد اور جہالت کے نقصانات، اساتذہ کے حقوق، والدین کی اطاعت جیسے محاسن سے آگاہی کا سلسلہ قائم کیا جائے، وقت کی قدر وقیمت کا احساس اجاگر کیا جائے، اس کے لیے ''قیمة الزمن عند العلماء'' سے استفادہ کیا جائے۔ (۷)

۳- اساتذہ میں احساسِ ذمہ داری کا فقدان

والدین کی توجہ اور بچوں کی رغبت کے باوجود تعلیم گاہوں میں آنے کے بعد بھی بچے علم سے

محروم رہ جاتے ہیں، اس کی بڑی وجوہات میں سے ایک وجہ اساتذہ کرام کا رویہ اور اپنے فرائض میں کوتاہی بھی ہے۔ اسلام کی روح سے استاذ کی کیا ذمہ داری بنتی ہے؟ اس پر بھی گفتگو کی جائے اور انہیں باور کرایا جائے کہ اساتذہ ادارے اور بچوں کے والدین کے امین بھی ہیں، جنہوں نے بچوں کے مستقبل کی باگ دوڑ ان کے ہاتھوں میں تھما دی ہے۔ استاد کے دل میں دوطرفہ دیانت داری وامانت داری کا احساس پیدا ہونا بہت ضروری ہے، ورنہ یہ علم کے فروغ میں رکاوٹ کے علاوہ امانت کے تقاضے بھی ضائع کرنے کا جرم شمار ہوگا۔ اساتذہ کو ان کے منصب اور منصب کے تقاضوں سے آگاہی کے لیے ''الرسول المعلمؐ وأساليبه فى التعليم'' سے استفادہ مفید رہے گا۔ (۸)

۴- تعلیمی ادارے کا فرض شناسی میں کوتاہی کا ارتکاب

فروغِ علم کے لیے بچوں کی رغبت، والدین کی دلچسپی اور اساتذہ کی لگن کے باوجود بسا اوقات تعلیمی ادارہ رکاوٹ اور مشکل کا سبب بن سکتا ہے۔ خاص قواعد وضوابط کی سختی کی بہتات وغیرہ ایسے امور ہیں جو ہمارے معاشرے کی بہت بڑی رکاوٹیں ہیں، ان رکاوٹوں کی وجہ سے تحصیل علم میں مشکل پیش آتی ہے اور بچے ناخواندہ رہ جاتے ہیں، اس لیے تعلیمی ادارے کے منتظمین کی نہ صرف تربیت بلکہ اس حوالے سے قانون سازی کی بھی ضرورت ہے۔ تعلیمی ادارہ کے مدنظر، تعلیم کا فروغ اور تربیت ہو، وہ تعلیم کا ادارہ رہے، محض تجارتی ادارہ نہ بنے۔

تیسری ذمہ داری: تعلیم کو بامقصد بنانے میں کردار ادا کرنا

علمائے کرام تعلیمی میدان کے متعلق اپنے قیمتی مشوروں اور تجاویز سے تعلیم کو بامقصد بنانے کے لیے کردار ادا کریں، خاص کر تعلیم کے بنیادی مقاصد (خداشناسی، نفس دانی، ناخواندگی کو خواندگی میں تبدیل کرنا اور معاشرتی ضروریات سے آگاہی اور منصوبہ بندی یعنی شعبہ کے لیے کارآمد، ذی استعداد اور باصلاحیت لوگ پیدا کرنا) کو پورا کرنے کے لیے علما کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ جو تعلیمی ادارے، تعلیمی نظام اور تعلیمی نصاب جیسے عظیم مقاصدِ تعلیم سے عاری ہوں، انہیں اپنے قیمتی مشوروں اور نصائح اور سفارشات کے ذریعہ سے بامقصد بنانے کی کوشش کرنا اہلِ علم کی ذمہ داری ہے۔

تقریباً سن ۶۶ء میں ہمارے اکابر میں سے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت علامہ محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان مقاصدِ تعلیم کی برآری کے لیے دینی وعصری علوم کے ماہرینِ تعلیم، جن میں تمام مسالک کے اکابر بھی شامل تھے، کی طویل مشاورت سے تعلیمی ونصابی تجاویز مرتب فرمائی تھیں، ان سے استفادہ کرتے ہوئے تعلیمی اداروں کی رہنمائی کی جائے، ان تجاویز کا نسخہ تقریباً ہر معروف تعلیمی ادارے میں موجود ہے، وہاں سے کاپی حاصل کی جاسکتی ہے۔ (۹)

چوتھی ذمہ داری: قرآنی مکاتب کا قیام

ہمارے مسلمان بچوں کی وہ تعداد جو باضابطہ دینی مدارس میں پڑھ رہی ہے اور علمِ دین حاصل

کررہی ہے وہ عصری تعلیم گاہوں میں پڑھنے والے بچوں کی تعداد کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ ایک سروے کے مطابق ہمارے ۹۸٪ بچے عصری تعلیمی اداروں میں جاتے ہیں اور ۲٪ طلبہ مدارسِ دینیہ میں زیرِتعلیم ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو عالم دین بننا فرضِ کفایہ ہے، جسے ۲٪ بچے پورا کررہے ہیں، لیکن ایک اچھا دین دار مسلمان بننا، فرائض، حلال وحرام اور پاکی وناپاکی کا بنیادی علم حاصل کرنا تو ہر مسلمان پر فرض عین ہے، اس فرضِ عین کی ادائیگی کے لیے اگر ہمارے عصری تعلیمی اداروں کے نصاب ونظام تعلیم میں کہیں ضروری دینی مواد موجود نہیں ہے تو ایسے تعلیمی اداروں میں پڑھنے والے اپنے مسلمان بچوں کو یہ مواقع فراہم کرنا اور اس کا اہتمام کرنا علمائے دین کی موروثی ذمہ داری شمار ہوگی۔ اس کی ایک اچھی اور آزمودہ شکل مکاتبِ قرآنیہ کا سلسلہ ہے، جس میں قرآن کریم حفظ یا ناظرہ، طریقۂ نماز، بنیادی ایمانیات اور ارکانِ اسلام بچوں کو سیکھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ یہ مکاتب شام اور رات کے اوقات میں ہر مسجد میں قائم ہونے چاہئیں، تاکہ ہمارے مسلمان بچے اگر کسی غیر مسلم اسکول میں بھی جائیں تو ان کا ایمان وعمل محفوظ رہے۔ ہمارے اساتذہ کے استاذ، مفتی اعظم پاکستان مفتی ولی حسن ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ: ’’جو بچہ مکتب سے گزر کر چلا جائے، وہ کبھی دین سے اپنا رشتہ نہیں توڑ سکتا‘‘۔

پانچویں ذمہ داری: تعلیمی سال کے آغاز کی طرح اختتام پر تعلیم وتربیت کے لیے فکرمندی

ہماری عصری تعلیم گاہوں میں جون جولائی کی سالانہ تعطیلات ہوتی ہیں، بچوں کی ان تعطیلات کو لغویات سے بچانے کے لیے کردار ادا کرنا بھی علمائے کرام کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ان تعطیلات کو اس طور پر کارآمد بنایا جائے کہ تعطیلات کا مقصد یعنی بچوں کا آرام وسکون بھی برقرار رہے، ان کا تعلیمی تسلسل بھی کسی نہ کسی درجہ میں باقی رہے، بچوں کو بنیادی دینی معلومات کا ضروری سامان بھی میسر آجائے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اسکول وکالج میں پڑھنے والے ہمارے بچوں کو مسجد کا نورانی ماحول نصیب ہوجائے، جہاں انہیں علمی ثمرات کے ساتھ ساتھ تربیتی فوائد کا کچھ حصہ بھی مل سکے، تاکہ ہمارے ایسے مسلمان بچے جو عصری تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم رہنے کے دوران کسی وجہ سے بنیادی دینی ضروریات سے واقف نہیں ہوسکے، یا انہیں اپنے محلے میں مکاتبِ قرآنیہ کی ترتیب میسر نہیں ہوسکی، یا وہ بچے اپنے نصابی حجم کی وجہ سے دین کی مطلوبہ معلومات حاصل نہیں کرسکے تو انہیں کم از کم سالانہ تعطیلات میں ایسے مواقع فراہم کیے جائیں جو ان کی بنیادی دینی تعلیمی ضرورت پوری کرسکیں۔

الحمدللہ! اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ۱۹۹۸ء میں ہمارے استاذ، جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی کے سابق استاذ الحدیث اور ناظمِ تعلیمات حضرت مولانا عطاء الرحمن شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ’’تعلیم وتربیت‘‘ کے نام سے ’’چالیس روزہ دینی واخلاقی تربیتی کورس‘‘ کا آغاز فرمایا تھا، جو ابتداءً جامع مسجد صالح ‘صدر کراچی سے شروع ہوا اور اگلے چند سالوں میں یہ سلسلہ ملک کے کئی چھوٹے بڑے شہروں تک وسیع ہوتا چلا گیا اور اب یہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی شروع ہوچکا ہے۔ اس

کورس کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مسلمان بچوں کو دین کی بنیادی اور ضروری باتوں کی تعلیم اور دینی ماحول میں ان کی ذہنی تربیت ہدف ہے۔ اس میں مسلکی شناخت اور اختلافی مسائل سے قصداً پہلوتہی کی گئی ہے، اس کی بدولت اس کورس سے مستفید ہونے والوں میں ہر مسلک کے بچے شامل ہیں اور سرکاری وغیرسرکاری مقامات پر شروع کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ الحمدللہ! سال بہ سال اس کورس کے لیے بچوں کی رغبت بڑھ رہی ہے اور اس کے مراکز میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہم اپنے اس تجربہ کی روشنی میں یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہمارے علمائے کرام آغازِ سال کی طرح اختتامِ سال کے موقع پر بھی مسلمان بچوں کے لیے فکرمند ہوں اور اپنی ذمہ داری کا احساس فرمائیں اور ہر محلے کی ہر مسجد میں اس طرح کے کورسز کا انعقاد فرمائیں تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اس سے علم کے فروغ میں اضافہ کے ساتھ ساتھ تعلیم کے بنیادی مقاصد یعنی فکری وعملی تربیت کے حصول میں مدد ملے گی۔ **أللّٰہم أرنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه وصلی اللّٰه وسلم علی سیدنا محمد وعلی آله وصحبه أجمعین**

حواشی وحوالہ جات

۱:...... ''اِقْرَأْبِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ۔'' (العلق: ۱) ترجمہ: ''اے پیغمبر! آپ (قرآن) اپنے رب کا نام لے کر پڑھا کیجیے جس نے پیدا کیا۔''

''الٓرٰ کِتٰبٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ إِلَی النُّوْرِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ۔(ابراهیم: ۱)

''یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر نازل فرمایا ہے، تاکہ آپ تمام لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف یعنی ذات غالب ستودہ صفات کی راہ کی طرف لاویں۔''

۲:......عن عبد اللّٰه بن عمروؓ قال: خرج النبی صلی اللّٰه علیه وسلم ذات یوم من بعض حجرۃ فدخل المسجد ، فإذا هو بحلقتین: إحداهما یقرؤون القرآن ویدعون اللّٰه ، والأخری یتعلمون ویعلمون، فقال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم : ''کل علی خیر ، هؤلاء یقرؤون القرآن ویدعون اللّٰه فإن شاء أعطاهم وإن شاء منعهم، وهؤلاء یتعلمون ویعلمون، وإنما بعثت معلما، فجلس معهم۔'' (سنن ابن ماجة، کتاب العلم، باب فی فضل من تعلم القرآن وعلمه، رقم الحدیث: ۲۲۹، ج: ۱، ص: ۱۵۵ ، ط: مکتبة أبی المعاطی)

۳:...... ''نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِیْ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا۔'' (الزخرف: ۳۲)

ترجمہ: ''دنیاوی زندگی میں ان کی روزی ہم نے تقسیم کر رکھی ہے اور ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے، تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے۔''

۴:...... ''عن أبی الدرداءؓ قال: سمعت رسول اللّٰه ﷺ یقول: إن العلماء ورثة الأنبیاء۔'' (مشکاة المصابیح ، ص: ۳۲ ، ط: قدیمی)

۵:...... ''عن عبداللّٰه بن عمرؓ قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم : ألا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته ، فالإمام الذی علی الناس راع وهو مسئول عن رعیته والرجل راع علی أهل بیته وهو مسئول عن رعیته، والمرأۃ راعیة علی بیت زوجها وولدها وهی مسئولة عنهم۔'' (مشکاة المصابیح، کتاب الإمارۃ، الفصل الاول، ص: ۳۲۰ ، ط: قدیمی)

۶:......ملاحظہ فرمائیے: تحفة المودود باحکام المولود، امام ابن قیم الجوزیةؒ ، ص: ۱۲۲–۱۲۳ ، ط: دارالکتب العلمیة ، بیروت ۔

نیز اسلام اور تربیت اولاد از مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار شہید رحمۃ اللہ علیہ، ط: دار التصنیف جامعہ علوم اسلامیہ، علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی ۔

۷:......قیمة الزمن عند العلماء، شیخ عبدالفتاح أبوغده رحمه الله ، المکتبة الغفوریة العاصمیة، کراتشی۔ اب اس کتاب کا تازہ ایڈیشن مزید اضافات کے ساتھ منظرِ عام پر آچکا ہے۔

۸:......الرسول المعلمؐ وأسالیبه فی التعلیم ، شیخ عبد الفتاح أبو غدۃ ، ط: المکتبة الغفوریة العاصمیة، کراتشی ۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی طبع ہو چکا ہے۔

۹:......تعلیمی تجاویز پر تبصرہ، ط: دار العلوم کراچی و مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن ۔

عہدِ رسالت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فقہی تربیت

اور اُس کے نتائج وثمرات

(دوسری قسط)

مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فقہی تربیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیاس ورائے (فقہی بصیرت) کو خود بھی بعض مواقع میں استعمال فرمایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی نہایت سیدھے سادے انداز سے اس طریقے کو سمجھایا اور ان کی تربیت کی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے گوناگوں شعبوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت جس انداز سے کی، اُس کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیں:

حج کی ادائیگی

ایک صحابی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: میری بہن نے حج کرنے کی نذر مانی تھی، وہ حج نہ کرسکی اور مرگئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’لو كان عليها دين أكنت قاضيه؟قال: نعم قال: فاقضِ دَيْنَ اللّٰهِ فَهُوَ أحقّ بالقضاء‘‘۔ (۱)

’’تیری بہن پر اگر قرض ہوتا تو کیا تو اُسے ادا کرتا؟ بولا: جی ہاں۔ فرمایا: اس کو ادا کر، اللہ تعالیٰ کا قرض اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس کو ادا کیا جائے۔‘‘

یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے قرض کو انسان کے قرض پر قیاس کیا، یہ علت دونوں میں موجود ہے، ان میں سے ہر فرض کی ادائیگی ضروری ہے۔

اسی طرح خثعمیہ نامی ایک خاتون نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میرے باپ پر حج فرض ہے، لیکن وہ بہت بوڑھا ہے، سواری پر بیٹھ نہیں سکتا، کیا میں اس کی طرف سے حج کرسکتی ہوں؟ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے، اس پر قرض ہوتا اور تم وہ ادا کرتیں تو کیا وہ کافی ہو جاتا؟ اس نے کہا: جی ہاں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اللہ کا قرض ادا کرنا زیادہ ضروری ہے۔ (۲)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاتون کو بھی فقہی بصیرت سے آشنا کردیا۔

میاں بیوی کی معاشرتی زندگی کا پہلو

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس وقت رسول اللہ ﷺ سے یہ بات عرض کی کہ: ایک دن میں خوشی میں تھا، میں نے روزے کی حالت میں بیوی کا بوسہ لیا (تو کیا روزہ جاتا رہا؟)۔ رسالت مآب ﷺ نے فرمایا: غور کرو اگر تم نے روزے کی حالت میں منہ میں پانی لیا اور اسے منہ میں پھرایا، کلی کی، تو کیا ہوگا؟ بولے: یہ کوئی حرج کی بات نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو کیا ہوا؟ روزہ پانی کے حلق سے اترنے سے ٹوٹے گا، اگر پانی حلق سے نہیں اترا تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ (۳)

یہاں صرف بوسہ لینا، یہ صورت ایسی ہے جیسے منہ میں پانی ڈالا اور وہ حلق سے نیچے نہ اترا، روزہ برقرار رہا، علت دونوں میں یکساں ہے، لہٰذا جو حکم ایک کا ہے، وہی حکم دوسرے کا ہوگا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے ایک مرتبہ عرض کیا کہ: مالدار صدقہ خیرات کرتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، وہ آخرت میں ہم سے بازی لے جائیں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم بھی یہ کرتے ہو۔ میں نے عرض کیا: وہ صدقہ کرتے ہیں، ہم صدقہ خیرات نہیں کرتے۔ سرکارِ دوعالم ﷺ نے فرمایا: تمہارے لیے بھی صدقہ ہے، تمہارا راستے سے ہڈی اٹھانا صدقہ ہے، تمہارا گناہ سے بچنا بھی صدقہ ہے، تمہارا کمزور کی مدد کرنا صدقہ ہے، اور تمہارا اپنی بیوی سے ہمبستری کرنا صدقہ ہے۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہمیں اپنی شہوت پوری کرنے پر اجر دیا جاتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (ذرا غور کرو اور دیکھو) اگر تم یہی کام اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور کے ساتھ کرتے تو کیا تم گنہگار نہ ہوتے؟ میں نے کہا: جی ہاں! تو کیا تم اپنے آپ کو شر و بدکاری سے نہیں روکتے ہو؟ اور کیا تم یہ نیک کام انجام نہیں دیتے ہو؟ (۴) اس حدیث میں بھی رسول اللہ ﷺ نے قیاس کیا۔ آپ ﷺ نے قیاس کے طریقے سے ہی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی رہنمائی فرمائی۔

معاملاتی پہلو

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سفر میں کسی قبیلے میں اتری (اس زمانے میں ان میں مہمانداری عام تھی، لیکن قبیلہ والوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کھانے وغیرہ کا نہیں پوچھا اور اس زمانے میں کسی ہوٹل وغیرہ کا کوئی رواج نہ تھا) اتفاقاً اس قبیلے کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا، انہوں نے اس کے علاج کی کوشش کی، وہ سودمند نہ ہوئی، قبیلے کے کچھ لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ان لوگوں سے بھی پوچھو، چنانچہ انہوں نے کہا: کیا تم میں کوئی سانپ کے کاٹے کا علاج جانتا ہے؟ ان میں سے ایک بولا: جی ہاں، میں جانتا ہوں، میرے پاس اس کا منتر ہے، لیکن تم نے ہماری مہمانداری نہیں کی، اس لیے ہم بھی بلا اجرت اس پر جھاڑ پھونک نہیں کریں گے، چنانچہ بکریوں کے ایک مختصر گلے پر معاملہ طے ہوگیا۔ وہ صحابیؓ گئے اور الحمد

شریف پڑھ کر دم کیا، سانپ کا زہر اتر گیا، چنانچہ معاملے کے مطابق جو طے تھا وہ انہیں دیا گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض نے کہا: یہ مال آپس میں تقسیم کرو، چنانچہ دم کرنے والا بولا: ابھی نہیں، بلکہ حضور اکرم ﷺ سے پوچھ کر تقسیم کریں گے، چنانچہ مدینہ آکر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ قصہ بتایا گیا، آپ ﷺ نے فرمایا: تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ الحمد اس کا منتر ہے؟ (انہوں نے عرض کیا: الحمد شریف ہر مرض سے شفا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے ٹھیک کیا، یہ مال باہم تقسیم کرو اور میرا بھی اس میں سے ایک حصہ رکھو، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ (۵)

یہاں صحابی رضی اللہ عنہ نے منتر کے عوض اجرت کو دوا کے عوض واجرت پر قیاس کیا، اس لیے کہ علتِ جامعہ دونوں میں عوض واجرت ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اجتہاد کی وجہ سے دوہرے اجر ملنے کی خوشخبری سنائی ہے۔ مذکورہ بالا حدیثوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نئے مسائل کے حل میں اجتہاد نہایت کامیاب ترین طریقہ ہے۔ نیز اس سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوجاتی ہے کہ اصول فقہ کے مبادی عہدِ رسالت ہی میں ظاہر ہوگئے تھے۔ (۶)

تجارت کے پہلو

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

”لعن اللّٰہ الیھود حرمت علیھم الشحوم فحملوھا فباعوھا“۔ (۷)

”یہودیوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور پھٹکار ہو، (گردے، آنتیں، اور معدے کی) چربیاں ان پر حرام کی گئی تھیں (انہوں نے اس کو چھوڑا نہیں، انہوں نے ان سے مالی فائدہ اٹھایا) انہیں بیچا اور بیچ کر اس کی قیمت کھائی۔“

چربی سے فائدہ اٹھانا حرام تھا، انہوں نے اس کی قیمت سے فائدہ اٹھایا، یہاں دیکھئے ”أکل“ (کھانا) بھی (باعثِ) انتفاع تھا اور خرید وفروخت کر کے مالی فائدہ اٹھانا بھی (باعث) انتفاع ہے۔ دونوں میں علت (انتفاع) یکساں موجود ہے تو حکم بھی دونوں کا یکساں ہوگا۔

رنگ وروپ کا پہلو

رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے یہاں کالا بچہ پیدا ہوا ہے۔ رسالت مآب ﷺ نے پوچھا: تمہارے پاس اونٹ ہیں؟ اس نے کہا: جی ہاں! موجود ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے پوچھا: ان کے رنگ کیسے ہیں؟ اس نے بتایا وہ سرخ ہیں، پھر سرورِ دوعالم ﷺ نے اس سے پوچھا: ان میں کوئی خاکی رنگ کا بھی ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں! موجود ہے۔ سرورِ کونین ﷺ نے فرمایا: وہ کہاں سے آیا؟ اس نے کہا: ممکن ہے مادہ کی کسی رگ نے یہ رنگ کھینچ لیا ہو، رسالت مآب ﷺ نے فرمایا: تو تیرے بیٹے کا رنگ بھی کسی رگ نے کھینچ لیا ہوگا۔ (۸)

ملاحظہ فرمائیں کہ حضور اکرم ﷺ نے باپ بیٹے کے رنگ وروپ کے اختلاف کو اونٹ کے رنگ وروپ کے اختلاف پر قیاس کیا اور آدمی کو بھی فقہی بصیرت کا ڈھنگ بتادیا۔

رسول اللہ ﷺ کے قیاس کا طریقہ یہ تھا کہ ایک چیز کا حکم اس کی نظیر سے پیش کرکے بتاتے تھے۔(۹) چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے ایک صحابیؓ سے فرمایا: تمہاری بیوی سے ہمبستری کرنا بھی صدقہ و خیرات کا حکم رکھتا ہے۔ صحابیؓ نے عرض کیا: کیا ہمیں اس شہوت کی تسکین کرنے میں بھی اجر دیا جاتا ہے؟ رسالت مآب ﷺ نے اس سے فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر تم یہ کام اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت کے ساتھ کرتے تو تم گنہگار نہ ہوتے؟ (معلوم ہوا جہاں نکاح کی علت نہ پائی جائے گی، وہاں یہ کام گناہ اور حرام ہوگا) صحابیؓ نے عرض کیا: جی ہاں ہوتا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ: جس طرح تمہارا برے کام پر مواخذہ اور گناہ ہوگا، اسی طرح خیر کے کام پر اجر ملے گا۔ تو دیکھئے! رسول ﷺ نے قیاس کیا اور محظور کا مقابلہ مباح سے کرکے یہ واضح فرمایا کہ: جس طرح محظور کے ارتکاب پر گناہ اور محاسبہ ہوتا ہے، اس کے مقابل مباح کے ارتکاب پر اجر ملتا ہے۔

بصیرت کے استعمال کی ترغیب اور ہمت افزائی

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ دو آدمی جھگڑتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے عمرو، ان کے درمیان فیصلہ کرو، انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ مجھ سے زیادہ اس کے حقدار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہاں! اس کے باوجود تم کرو۔ انہوں نے عرض کیا: اس فیصلے پر مجھے کیا ملے گا؟ میں کیونکر فیصلہ کروں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم نے ٹھیک فیصلہ کیا تو تمہارے لیے دس نیکیاں ہیں اور اگر تم نے اجتہاد کیا اور اس میں بھول چوک ہوئی تو تمہیں ایک نیکی ملے گی۔(۱۰) اور عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح سے مروی ہے۔

شرائط صلح کی پابندی میں قیدی صحابیؓ کی فقہی بصیرت

صلح حدیبیہ ۶ ہجری کے بعد حضرت ابوبصیر رضی اللہ عنہ جب مشرکین کے چنگل سے بھاگ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آگئے تو صلح حدیبیہ کی شرط کے مطابق قریش نے دو آدمی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں بھیجے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ حضور اکرم ﷺ شرط کے مطابق ابوبصیر کو واپس کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں واپس کیا، جب مدینہ سے باہر نکلے تو ابوبصیر رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ایک کو جان سے مار ڈالا اور دوسرا بھاگ کر واپس حضور اکرم ﷺ کے پاس آگیا اور ابوبصیر رضی اللہ عنہ کے کارنامے کی خبر کی، ابوبصیر رضی اللہ عنہ ''سِیفُ البحر'' (ساحل سمندر) جا پہنچے۔ یہ خبر جب مکہ میں کچھ مسلمانوں کو لگی تو وہ بھی ابوبصیر رضی اللہ عنہ سے جاملے اور مشرکین پر حملے شروع کیے۔(۱۱)

ابوبصیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی یہ کام اپنے اجتہاد سے کرتے رہے اور حضور اکرم ﷺ نے

ان پر کوئی نکیر اور گرفت نہیں کی ، اس لیے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی حدود و شرائط سے خارج تھے ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مکہ کے مسلمانوں کو جو خط ابو بصیر رضی اللہ عنہ سے جا ملنے کے لیے لکھا تھا ، وہ حضورِ اکرم ﷺ کی اجازت سے نہیں لکھا تھا ۔ حضورِ اکرم ﷺ نے اس پر نکیر بھی نہیں کی اور نہ حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ کے کافر کو قتل کرنے پر کوئی گرفت کی اور نہ ان کے قیام ساحلِ سمندر پر کوئی باز پرس کی اور نہ ان سے جا ملنے والوں پر کچھ گرفت کی ، اس لیے کہ یہ ان کی فقہی بصیرت اور اجتہادی فکر و نظر کا نتیجہ و ثمرہ تھا اور درست تھا ۔

نماز کی امامت میں فقہی بصیرت

اسی طرح حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے : قوم و قبیلے میں جو سب سے بڑا قاری ہو ، وہ امامت کرے اور قراءت میں سب برابر ہوں تو جو اُن میں سنت کا سب سے بڑا عالم ہو وہ امامت کرے ، چنانچہ دو ہم رتبہ اور قریب قریب میں سے ایک کو زیادہ بڑا اقرار دینا اجتہادی امر ہے ۔ (۱۲)

حضورِ اکرم ﷺ کا حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے یہ فرمانا کہ تم اپنی کمزور قوم کے امام ہو ، لہٰذا کمزور ترین کی اقتدا کا خیال رکھو ، کمزور ترین کو جاننا اجتہادی طریقے سے ہی ہو سکتا ہے ۔ (۱۳)

نماز میں شک اور فقہی بصیرت سے فیصلہ

اسی طرح نماز کے اندر شک میں مبتلا شخص کا ظنِ غالب پر عمل کرنا ، یہ بھی ایک اجتہادی امر ہے ۔

امان وسفارش

اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دودھ شریک بھائی عبداللہ بن ابی سرح کا واقعہ ہے جن کے قتل کا حکم رسول اللہ ﷺ نے دے دیا ، پھر بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں ''امان'' دی اور انہیں حضورِ اکرم ﷺ کے پاس لا کر بیعت کی سفارش کرتے رہے ۔ رسول اللہ ﷺ اس خیال سے کہ اس کے قتل کا حکم دیا جا چکا ہے ، کوئی اُسے آ کر قتل کر دے کچھ دیر رکے رہے ، جب کوئی آگے نہ بڑھا تو رسالتمآب ﷺ نے اس کو بیعت کر لیا ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ''امان دہی اور سفارش'' اجتہادی کام تھا ، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان پر نکیر نہیں کی ۔ (۱۴)

میدانِ جنگ میں انتخابِ امیر

رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ موتہ ۸ھ میں لشکر روانہ کیا تو فرمایا تھا کہ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (۸ھ/ ۶۲۹ء) شہید ہو جائیں تو زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ۸ھ/ ۶۲۹ء) کو امیرِ لشکر بنایا جائے ، یہ شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ (۸ھ/ ۶۲۹ء) کو امیر بنایا جائے ۔ یہ بھی شہید ہو گئے تو لشکر بغیر امیر لشکر رہ گیا ۔ یہاں صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضورِ اکرم ﷺ کی ہدایت کے مطابق اپنی فقہی بصیرت سے حضرت

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ (۲۱ھ/۶۴۲ء) کو امیر لشکر چن لیا، جب دربار رسالت ﷺ میں اس امر کی اطلاع کی گئی تو رسول اکرم ﷺ نے اس اجتہادی عمل کو درست قرار دیا۔ (۱۵)

طہارت میں پانی پر قادر نہ رہنے میں فقہی رہنمائی

۱:......اسی طرح غزوۂ ذات السلاسل ۷ یا ۸ ہجری میں سردی کی رات، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو احتلام ہوگیا، چنانچہ انہیں یہ ڈر ہوا کہ اگر میں نہایا تو ہلاکت کا خطرہ ہے، تیمّم کیا اور صبح (فجر) کی نماز پڑھائی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس واقعہ کا تذکرہ رسالت مآب ﷺ سے کیا۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''یا عمرو! صلیت بأصحابک وأنت جنب؟'' ......''اے عمرو! تم نے احتلام کی حالت میں اپنے رفقا کو نماز پڑھا دی؟''۔ (حضرت عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں) نہ نہانے کی میں نے وجہ بتائی اور عرض کیا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَلَا تَقْتُلُوْا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا''۔ (۱۶) حضور اکرم ﷺ نے اس قیاس شرعی کو تسلیم کیا، نہ کوئی گرفت کی، نہ ملامت اور تقریراً آپ ﷺ نے ان کے اجتہاد اور فقہی بصیرت کو درست قرار دیا۔ (۱۷)

یہاں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جان کی ہلاکت کی صورت کو تیمّم کے جواز کی صورت پر قیاس کیا، کیونکہ دونوں صورتوں میں علت مشترکہ پانی کے استعمال پر قادر نہ رہنا ہے۔ (۱۸)

۲:......''عن أبی سعید رضی اللّٰہ عنہ أن رجلین تیمما و صلّیا ثم وجدا ماءً فی الوقت فتوضأ أحدهما و عاد لصلاته ما كان فی الوقت ولم یعد الأخر فسألا النبی ﷺ فقال للذی لم یعد أصبت السنة و أجزأتک صلاتک وقال للأخر أما أنت فلک مثل سهم جمع۔''(۱۹)

''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ دو شخصوں نے تیمّم کر کے نماز پڑھی، پھر وقت کے رہتے رہتے پانی مل گیا، ایک نے وضو کر کے نماز لوٹائی اور دوسرے نے نماز نہیں لوٹائی، پھر ان دونوں نے بارگاہ رسالت ﷺ میں جا کر یہ واقعہ بیان کیا، اور اس کے متعلق حکم پوچھا۔ جس شخص نے نماز نہیں لوٹائی، اس سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم نے سنت کے مطابق عمل کیا، تم نے جو نماز پڑھی وہ کافی ہوگئی، اور دوسرے شخص سے فرمایا: تم کو ثواب کا پورا حصہ ملے گا، یعنی تم نے دونوں نمازوں کا ثواب پایا۔ (اس نے اپنے اجتہاد کی وجہ سے دوہرا اجر پایا)۔''

۳:......''عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنهما قال: قال النبیّ صلی اللّٰہ علیه وسلم: یوم الأحزاب لا یصلّین أحد العصر إلا فی بنی قریظة فأدرک بعضهم العصر فی الطریق، فقال بعضهم: لا نصلّی حتّٰی نأتیها، وقال بعضهم: بل نصلی لم یردمنّا ذٰلک، فذکر ذٰلک للنبیّ ﷺ فلم یعنّف واحدًا منهم۔''(۲۰)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انہوں نے کہا: آنحضرت ﷺ نے جنگ خندق

۵ ھ میں (جب جنگ ہوچکی) یوں فرمایا: تم میں سے ہر شخص عصر کی نماز بنی قریظہ کے پاس پہنچ کر پڑھے۔ اب نماز کا وقت راستے میں آ پہنچا تو بعض نے کہا: ہم تو جب تک بنی قریظہ کے پاس نہ پہنچ لیں گے، عصر کی نماز نہیں پڑھیں گے اور بعض نے کہا: ہم نماز پڑھ لیتے ہیں، کیونکہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا یہ مطلب نہ تھا کہ ہم نماز قضا کریں، پھر بارگاہ رسالت ﷺ میں اس واقعہ کا ذکر آیا، رسول اللہ ﷺ نے کسی پر خفگی نہیں کی، ہر ایک کے عمل کو درست قرار دیا۔‘‘

عہدِ رسالت میں دو مجتہدین کی اجتہادی آرا

نماز کا وقت راستے میں ہوگیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں دو جماعتیں ہوگئیں، ایک نے راستے میں وقت پر نماز ادا کی، اور دوسری جماعت نے بنی قریظہ میں وقت نکل جانے کے بعد نماز پڑھی، دونوں کا اندازِ فکر ونظر جداگانہ تھا۔ ایک جماعت کی رائے تھی کہ نماز وقت پر ادا کرنے کا حکم ہے، لہٰذا نماز کا وقت راستے میں آ گیا ہے، یہیں ادا کرنا ہے۔ دوسری جماعت نے بنی قریظہ میں جا کر نماز پڑھی، دونوں کی نیت بخیر تھی، اس لیے کسی پر ملامت وگرفت نہ کی۔ اس اندازِ تربیت سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ مجتہد ہر اس مسئلے میں جس میں نص موجود نہ ہو، اپنی فقہی بصیرت پر عمل کرسکتا ہے، اس کی رائے درست نہ ہو تو بھی اس سے مواخذہ نہ ہوگا، بلکہ حق کی جستجو میں جو کوشش کی ہے اس کا ایک اجر ملے گا، جیسا کہ دوسری حدیث سے ثابت ہے۔ [۲۱] قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ حدیث مذکور کی شرح میں رقم طراز ہیں:

’’اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ فروعی مسائل میں (مجتہد سے) بھول چوک معاف ہے۔ اور ان فروعی مسائل میں سے جس مسئلے (کے نتیجے) تک مجتہد کا اجتہاد اُسے پہنچائے، اس میں مجتہد کی ملامت وگرفت نہیں کی جائے گی، اس کے برعکس اصول کے مسائل (یعنی عقائد) میں معافی نہیں اور یہ مذکورہ بالا صورت میں جب صحابہ رضی اللہ عنہم کی نظر میں دلائل متعارض ہوگئے، چنانچہ نماز کو اپنے وقت پر پڑھنے کا حکم تو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ نماز کو بنی قریظہ پہنچنے سے پہلے ادا کیا جائے۔ اور ’’**أن لا یصلین أحدٌ العصرَ إلا فی بنی قریظة**‘‘ کا حکم اس امر کو چاہتا ہے کہ نماز وقت نکلنے کے بعد بنی قریظہ میں پڑھی جائے، تو کون سے ظاہر کو مقدم کیا جائے، اور کون سے عام پر عمل کیا جائے؟ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۵۴۴ ھ) نے فرمایا کہ: رسول اللہ ﷺ کی مراد بنی قریظہ تک پہنچنے میں جلدی کرنا تھا، نفس نماز کو مؤخر کرنا، اس میں سستی اور کوتاہی کرنا مراد نہ تھا۔ جس نے اس مفہوم کو لیا، اس نے نماز کے فوت ہونے کے اندیشے سے نماز وقت میں ادا کی اور جس نے ظاہر لفظ کو لیا، مقصود کو نہ سمجھا، اس نے اس پر عمل کیا اور نماز مؤخر کی، تو اس حدیث میں دونوں مکاتب فکر کی دلیل موجود ہے۔ جو مکتب فکر ظاہری الفاظ پر عمل کا قائل ہے، اس کی بھی دلیل ہے اور جو مکتبۂ فکر منشأ ومقصد (بات کی تہہ

تک پہنچنے) کا خوگر ہے، اس کی بھی دلیل موجود ہے۔ ''(۲۲)

امام محی الدین یحییٰ بن شرف نووی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۶۷۶ھ) فرماتے ہیں:

''نماز کا وقت تنگ ہو جانے کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم میں نماز اپنے وقت میں ادا کرنے، یا اس میں اتنی دیر کرنے میں کہ قضا پڑھنی پڑے، اختلاف ہوا۔ اس اختلاف کا سبب یہ تھا کہ شریعت کے دلائل ان کی نظر میں متعارض ہو گئے، اس طرح کہ نماز کو وقت پر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور یہاں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد: ''**لايصلين أحدٌ العصرَ أو الظهرَ إلّافي بني قريظة**'' کا ایک مفہوم یہ ہے کہ: بنی قریظہ کی طرف جانے میں جلدی کی جائے اور جلدی پہنچنے میں کوئی چیز مانع نہ ہو، محض نماز کی تاخیر مقصود نہیں، لہٰذا بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے ''**لايصلين**'' کے معنی ومنشأ کے پیش نظر وقت پر نماز پڑھی اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ظاہر الفاظ پر عمل کیا اور بنی قریظہ میں جا کر قضا نماز پڑھی۔ اس واقعے کا ذکر جب بارگاہ رسالت ﷺ میں کیا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے کسی فریق پر نہ گرفت کی، نہ ملامت کی، کیونکہ ہر فریق نے اپنے اجتہاد پر عمل کیا، اس لیے اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوئیں: ۱:...... ظاہر الفاظ پر اور ۲:...... قیاس رائے پر عمل کرنا، یہ دونوں درست ہیں۔ چنانچہ اس حدیث میں ان لوگوں کی بھی دلیل پوشیدہ ہے جو اجتہاد وقیاس کے قائل ہیں اور معنی ومنشأ کا خیال رکھتے ہیں اور اس فریق کی بھی دلیل موجود ہے جو ظاہر الفاظ پر عمل پیرا رہتے ہیں، نیز اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ مجتہد کو اس کے اجتہاد پر عمل کرنے میں ملامت نہیں کی جائے گی، جب کہ اس نے حق کی جستجو میں اپنی پوری کوشش کی ہو۔ ''(۲۳)

اس حدیث پر علامہ ابن قیم الجوزیہ رحمۃ اللہ علیہ (۷۵۱ھ) نے سیر حاصل بحث کی ہے، وہ بھی ہدیۂ ناظرین ہے، وہ فرماتے ہیں:

''فقہا کا اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ ان دونوں فریقوں میں سے کونسا فریق زیادہ حق سے قریب رہا ہے؟ فقہا کی ایک جماعت کہتی ہے: کہ جن صحابہ رضی اللہ عنہم نے نماز مؤخر کی، وہ اپنے اجتہاد میں حق سے قریب رہے۔ اگر ہم ان کے ساتھ ہوتے تو ہم بھی ایسا کرتے، جیسے انہوں نے نماز مؤخر کی، اور ہم بھی بنی قریظہ میں نماز پڑھتے، تاکہ رسول اللہ ﷺ کے حکم: ''**لايصلين أحدٌ العصرَ إلّا في بني قريظة**'' پر عمل پیرا رہتے، فی الفور نماز نہ پڑھتے۔ اور فقہا کی دوسری جماعت کا قول یہ ہے کہ نہیں بلکہ جن صحابہ رضی اللہ عنہم نے راستے میں اپنے وقت پر نماز پڑھی، انہوں نے سبقت کی فضیلت حاصل کی، اور دونوں فضیلتوں سے سرفراز ہوئے، اس لیے کہ انہوں نے رسالت مآب ﷺ کے حکم کو: ۱:...... جلد از جلد پورا کرنے کی کوشش کی۔ ۲:...... اور اپنے وقت پر نماز پڑھنے میں سرورِ کونین ﷺ کی رضا جوئی کی

خاطر جلدی کی ۔۳: ...... پھر قوم کے ساتھ جا ملنے میں بھی جلدی کی، تو انہوں نے جہاد کی فضیلت بھی پائی، نماز کو اپنے وقت میں پڑھنے کی فضیلت بھی حاصل کی اور رسول اللہ ﷺ کی منشأ کو پانے میں بھی کامیاب رہے۔ یہ جماعت دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ فقیہ نکلی اور خاص کر یہ نماز تو عصر کی نماز تھی، اور یہی صلاۃ الوسطیٰ ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کی اس صحیح صریح نص کی وجہ سے جس کا کوئی معارض نہیں اور اس میں کوئی طعن بھی نہیں۔ نماز عصر کی پابندی کرنے، اس میں تاخیر نہ کرنے، اس کو جلدی پڑھنے کے متعلق حدیث میں تاکید آئی ہے۔ اس کے متعلق یہ حدیث بھی موجود ہے کہ جس سے یہ نماز فوت ہوئی تو گویا کہ اس کے اہل وعیال اور مال سب برباد ہوگئے، اس کا عمل ضائع ہوگیا، پس جو تاکید اس نماز کے متعلق آئی ہے، اس جیسی تاکید اس کے سوا دوسری نمازوں کے متعلق نہیں آئی۔ بہر حال! جن حضرات نے نماز مؤخر کی، ان کے پاس بھی نماز مؤخر کرنے کا عذر موجود ہے، ان کو ایک اجر ملے گا، یہ اس لیے ملا کہ انہوں نے ظاہرِ نص کو نہیں چھوڑا، ان کی غرض اس سے حضور ﷺ کے ارشاد کی تعمیل تھی، اسی لیے حق تک رسائی میں ان دونوں میں سے کوئی بھی خطا کار نہیں۔ بلکہ جن صحابہ رضی اللہ عنہم نے راستے میں نماز پڑھی، انہوں نے دونوں دلائل میں موافقت اور تطبیق کی، دونوں فضیلتوں کو حاصل کیا، اس لیے ان کے لیے دوہرا اجر ہے اور دوسرے حضرات بھی اجر کے مستحق ہیں۔‘‘ (۲۴)

آپ نے دیکھا کہ جس جماعت نے نماز وقت پر ادا کی، اس نے اپنی فقہی بصیرت سے گوناگوں اجر کس خوبی سے سمیٹے! یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر فقیہ اللہ تعالیٰ کے یہاں محبوب وپسندیدہ ہوتا ہے اور اس کا مرتبہ دوسروں سے بلند تر رہتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱: ......صحیح البخاری، ج:۲، ص:۹۹۱، کتاب الأیمان والنذور، باب من مات وعلیہ نذر۔
۲: ......سنن النسائی، باب حج المرأۃ عن الرجل، ج:۲، ص:۴، طبع: قدیمی کتب خانہ۔
۳: ......أبوداؤد، کتاب الصوم، باب القبلۃ للصائم، حدیث نمبر: ۲۳۸۵، الحاکم، ج:۱، ص:۴۳۔
۴: ......مسند احمد، بیروت، المکتب الاسلامی، ج:۵، ص:۱۵۴۔
۵: ......صحیح البخاری، کتاب الاجارۃ، ۳/۱۲۱۔
۶: ......الوصول إلی قواعد الأصول، ص:۱۶۔
۷: ......صحیح البخاری، ج:۴، ص:۲۰۷۔
۸: ...... بخاری، ج:۷، ص:۶۸، کتاب الطلاق۔
۹: ......أصول الجصاص، ج:۲، ص:۲۲۴۔
۱۰: ......مسند احمد، ج:۴، ص:۲۰۵۔
۱۱: ......صحیح البخاری، حدیث نمبر:۲۷۳۴۔
۱۲: ......أصول الجصاص، ج:۲، ص:۲۲۳۔
۱۳: ......ایضاً۔
۱۴: ......ایضاً۔
۱۵: ......ایضاً، ج:۲، ص:۲۱۶۔
۱۶: ......النساء:۲۹۔
۱۷: ......سنن ابوداؤد، ج:۱، ص:۱۴۵۔
۱۸: ......سنن النسائی، کراچی، قدیمی، ص:۵۷۔
۱۹: ......الأحکام، ج:۵، ص:۹۴۔
۲۰: ......ترجمۂ مسلم، وحید الزمان، ج:۴، ص:۱۳۶۔
۲۱: ......ایضاً۔
۲۲: ......اکمال المعلم، ج:۶، ص:۱۱۰، طبع دار الوفاء۔
۲۳: ......مسلم، ج:۲، ص:۹۶۔
۲۴: ......زاد المعاد، بیروت، مکتبہ ’’المنار الاسلامیۃ‘‘، ج:۳، ص:۱۳۱۔

(جاری ہے)

www.banuri.edu.pk

عالمِ عربی کے معروف عالم شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ شعیب ارنؤوط کی نظر میں

ترجمہ وترتیب: مولانا محمد یاسر عبداللہ

شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۳۲ھ-۱۹۱۴ء/۱۴۲۰ھ-۱۹۹۹ء) گزشتہ صدی میں عرب دنیا کے معروف عالم گزرے ہیں۔ ابتدائے عمر میں ہی ان کا خاندان البانیہ سے ہجرت کر کے شامی شہرِ دمشق میں آبسا اور وہیں شیخ کی علمی نشوونما ہوئی، بعد میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور دیگر تعلیمی اداروں کی رونق بنے۔ ان کا اختصاصی فن ''علمِ حدیث'' تھا، آغازِ شباب میں ہی اس علم سے رشتہ جوڑا اور پھر تادمِ آخر اسی کے ہو رہے، اکثر علمی کاوشیں اسی علم کی خوشہ چینی کا ثمرہ ہیں۔ اپنی بعض منفرد تحقیقات کی بنا پر معاصر اہلِ علم کی تنقید کا نشانہ بنتے رہے ہیں [1]، انہی ناقدین میں سے ایک عصرِ حاضر کے معروف محقق شیخ شعیب ارنؤوط بھی ہیں، جو خود بھی البانوی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا خاندان بھی شام کی طرف ہجرت کر کے یہیں بس گیا تھا۔ شیخ البانیؒ کے ساتھ ان کے خاندانی تعلقات استوار رہے ہیں، کچھ عرصہ قبل شیخ ارنؤوط کے ایک شاگرد شیخ ابراہیم زیبق نے ان کے حالات اور علمی خدمات پر ایک کتاب ترتیب دی تھی، جو ''**المحدّث العلّامة الشيخ شعيب الارنؤوط،سيرته فى طلب العلم وجهوده فى تحقيق التراث**'' کے نام سے عالمِ عرب کے معروف اشاعتی ادارے ''دار البشائر الإسلاميّة، بيروت'' سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکی ہے، اس کتاب کے ایک حصے میں شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقات کے متعلق ان کی بعض تنقیدی آرا کا تذکرہ ہے۔ علمی دنیا میں اختلاف کوئی اَنہونی چیز نہیں، ''آدابِ اختلاف'' کی رعایت رکھتے ہوئے متانت کے ساتھ شائستہ لب و لہجے اور سنجیدہ اسلوب میں اپنی آرا کا اظہار، معتدل مزاج اہلِ علم کا امتیازی خاصہ رہا ہے۔ شیخ ارنؤوط کی یہ تحریر بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے، چونکہ شیخ بذاتِ خود ایک نام وَر محقق ہیں، شیخ البانیؒ سے ان کے خاندانی مراسم رہے ہیں، ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور کام کرنے کے مواقع انہیں حاصل رہے ہیں اور ان کی کتب وتحقیقات پر بھی وہ گہری نگاہ رکھتے ہیں، اس لیے تحریر کے مندرجات سے کلی اتفاق نہ ہونے کے باوجود ان کا یہ علمی نقد وتبصرہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ اسی نقطۂ نظر کے تحت کتاب کے اس حصے کو اردو ترجمانی کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا جارہا ہے۔ (مرتب)

شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ کا امتیازی کارنامہ

مجھے اس حقیقت کے اظہار میں کوئی تردّد نہیں کہ شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ کو بیک وقت اپنے موافق ومخالف دونوں طبقوں میں علمِ حدیث کے مطالعے اور اس میں مزید تحقیق وجستجو کا شوق ورغبت پیدا

کرنے کا شرف حاصل ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ (ماضی قریب میں) انہیں کے دم قدم سے مصر وشام میں حدیثی مشاغل کو دوبارہ توانائی نصیب ہوئی ہے۔ اس کارنامے پر اللہ تعالیٰ ان کو مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے اور اس کا اجر وثواب ان کے نامۂ اعمال میں محفوظ فرمائے۔ لیکن وہ اس میدان کے پہلے شہسوار نہیں تھے، ان سے قبل مصر میں شیخ محمد رشید رضا، شیخ احمد شاکر اور ان جیسے دیگر ازہری علما اور شام میں شیخ جمال الدین قاسمی اور شیخ محمد بہجۃ البیطار جیسے (محدثین) گزر چکے ہیں، بنابریں انہیں ترکِ تقلید ورجوع الی السنۃ کا داعیٔ اول نہیں قرار دیا جاسکتا، لیکن انہوں نے اپنے ان پیش رؤوں کے سنجیدہ واطمینان بخش اسلوب سے استفادہ نہیں کیا، بلکہ مخالفین کے ساتھ اشتعال انگیز انداز اپنایا، گویا (اس طرزِ عمل سے) وہ انہیں قائل کرنے کی بجائے شکستہ کردینا چاہتے تھے، نتیجتاً (مسلمانوں کے) دو طبقوں کے درمیان ایسی معرکہ آرائی ہوئی کہ جس میں علمی مباحثہ ومناقشہ کی بجائے سب وشتم تک نوبت جا پہنچی۔

مجھے اس بات سے بھی انکار نہیں کہ شیخ کتاب وسنت کے داعی تھے جو بلاشبہ خوش آئند راہ ہے، لیکن درحقیقت وہ اپنی تحقیق کی روشنی میں صحیح قرار پانے والی احادیث وسنن کی طرف دعوت دیتے تھے، ان کی چاہت تھی کہ ان کی تصحیح کو ائمہ متبوعین کے اجتہاد کے برابر کا درجہ حاصل ہو اور متنازع مسائل میں انہی کی رائے ''قولِ فیصل'' قرار پائے۔ لیکن یہ مقام نہ انہیں حاصل ہوا اور نہ ان کے علاوہ کسی کے حصے میں آیا، اس لیے کہ (ائمہ فقہا کا) یہ اختلافِ محمود اللہ تعالیٰ کا پسند فرمودہ ہے اور اسی کے پیدا کردہ اسباب کے تحت وجود میں آیا ہے۔

(غور کیجیے کہ) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تو محض بارگاہِ رسالت (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) سے علم حاصل کرنے والے تھے، لیکن اس کے باوجود بعض مسائل میں ان کے درمیان بھی اختلاف ہوا ہے۔ نیز اختلافی مسائل میں سے جس مسئلے میں بھی ائمہ نے نصوص کی بنیاد پر کوئی قول اختیار کیا ہے، اس کی نظیر صحابہؓ وتابعینؒ میں ملتی ہے۔ فقہی مسائل میں اختلاف کا آغاز عہدِ صحابہؓ میں ہی ہو چکا تھا اور یہ عین منشأ خداوندی کی تکمیل تھی، اسی کا ثمرہ ہے کہ ہماری اسلامی تہذیب میں تنوع اور فہم کے دائروں میں وسعت دکھائی دیتی ہے، جس میں فکری واختراعی مقابلے کے لیے کھلا میدان مہیا ہے۔ اگر علمی اختلافات نہ ہوتے تو یہ عظیم تالیفات منظرِ عام پر نہ آتیں، جن کی بدولت دورِ تدوین سے آج تک ہمارے کتب خانے بھرے پڑے ہیں۔

علمِ حدیث اور شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ ناصر الدین رحمۃ اللہ علیہ کا امتیازی فن ''علمِ حدیث'' ہے، اس علم کے مطالعہ وتحقیق میں شیخ نے اپنی زندگی کی طویل مدت تقریباً ساٹھ برس صرف کیے ہیں، البتہ شیخ کو اس فن میں دیگر محدثین کا سا مقام

www.banuri.edu.pk

ہی حاصل ہے، یعنی ان سے بھی خطأ وصواب دونوں کا صدور ہوا ہے۔

''نقدِ متن'' کی طرف عدمِ التفات

مجھے شیخ کی اس بات سے بے حد تعجب ہے کہ انہوں نے ''**علم مصطلح الحدیث**'' میں ضرور پڑھا ہوگا کہ ''حدیثِ صحیح وہ ہے کہ جس کی سند راوی سے لے کر نبی کریم ﷺ تک متصل ہو اور وہ روایت' علت یا شذوذ سے خالی ہو''۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ احادیث پر حکم لگانے کے سلسلے میں انہوں نے ''شذوذ'' اور ''علت'' کی طرف توجہ کی، نہ متنِ حدیث پر نقد کرتے ہوئے ان سے اعتنا کیا، لہٰذا ان کے ہاں اسناد ''صحیح'' ہو تو حدیث بھی ''صحیح'' قرار پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایسی بہت سی احادیث کو ''صحیح'' قرار دیا ہے، جن کے متون پر علما کو کلام ہے، مثلاً:

۱- ''**مشکوٰۃ المصابیح**''(۲) اور ''**صحیح الجامع الصغیر**''(۳) کی روایت ہے: ''**الوائدۃ والموؤدۃ فی النار**''۔ (بچی کو زندہ گاڑنے والی عورت اور جس کو گاڑا گیا ہو دونوں دوزخ میں ہیں) شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو ''صحیح'' کہا ہے، حالانکہ یہ حدیث، قرآنی آیت ''**وَإِذَا الْمَوْؤُدَةُ سُئِلَتْ**''(۴) (اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جاوے گا) کے صراحتاً خلاف ہے، اگرچہ شیخ نے اس کی دل نہ لگتی توجیہ وتاویل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

۲- ''**سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ**''(۵) میں شیخ نے درجِ ذیل روایت کو ''صحیح'' قرار دیا ہے: ''**إن اللّٰہ خلق التربۃ یوم السبت**'' (اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہفتہ کے دن پیدا کیا ہے) اس روایت کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ''**صحیح مسلم**''(۶) میں اسی طرح نقل کیا ہے، لیکن یہ حدیث' قرآنِ کریم کے متعارض ہے۔ نیز سند میں اسماعیل بن امیہ کی وجہ سے اس کو ''**معلول**'' بھی کہا گیا ہے، اس لیے کہ اسماعیل نے اس کو درجِ ذیل سند کے ساتھ روایت کیا ہے: ''**إسماعیل، عن أیوب بن خالد، عن عبد اللّٰہ بن رافع -مولٰی أم سلمۃ- عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ مرفوعاً**''۔

اسماعیل ہی نے اس روایت کو ''**عن إبراہیم بن أبی یحیی، عن أیوب بن خالد**'' کے طریق سے بھی نقل کیا ہے اور چونکہ ابراہیم ''**متروک**'' ہیں، اس لیے اسماعیل نے ان کو سند سے ساقط کر دیا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ''**التاریخ الکبیر**''(۷) میں اسماعیل بن امیہ ہی سے یہ روایت نقل کی ہے، امام موصوف نے بعض محدثین کا قول نقل کیا ہے کہ: ''**عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ عن کعب**''، اصح ہے''، یعنی یہ روایت کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ کی اسرائیلیات میں سے ہے، لیکن شیخ ناصر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ پر رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''یہ بعض کون ہیں؟ اور حفظ وضبط کے اعتبار سے ان کا کیا مقام ہے، تاکہ اس روایت کو عبد اللہ بن رافع کی روایت پر ترجیح دی جا سکے؟''۔ آگے لکھتے ہیں کہ: ''یہ حدیث' قرآنِ کریم کے خلاف نہیں، جیسا کہ بعض لوگوں کو وہم ہوا ہے''۔ لیکن عدمِ مخالفت پر کوئی دلیل ذکر نہیں کی۔

۳-''سلسلة الأحاديث الصحيحة''(۸) میں درج ذیل روایت کو شیخ نے ''صحیح'' قرار دیا ہے: ''أمتی أمة مرحومة، لیس علیها عذاب فی الآخرة، وإنما عذابها فی الدنیا''۔ (میری امّت پر خدا کی خاص رحمت ہے، اس کے لیے آخرت میں کوئی عذاب نہیں، اس کا عذاب دنیا میں ہی ہے) اور تصحیح کی علت بیان کرنے کی کوشش یوں کرتے ہیں کہ: ''امت سے مراد امت کی اکثریت ہے، اس لیے کہ یہ بات تو قطعی ہے کہ بعض لوگ گناہوں سے پاکی حاصل کرنے کے لیے جہنم میں داخل ہوں گے''۔
ہم نے ''مسند احمد''(۹) کی تعلیق میں اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، اور فنِ حدیث کے ماہر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ''التاریخ الکبیر''(۱۰) میں اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے، اس لیے کہ انہوں نے اس حدیث کے طرق اور ان میں اضطراب بیان کرنے کے بعد لکھا ہے: ''والخبر عن النبی ﷺ فی الشفاعة، وأن قومًا یعذبون ثم یخرجون أكثر وأبين وأشهر''۔ یعنی ''شفاعت اور کچھ لوگوں کو عذاب دے کر جہنم سے نکالے جانے کے متعلق بہت سی احادیث ہیں، جو زیادہ واضح اور مشہور ہیں''۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے سند کا اضطراب بیان کرنے کے ساتھ متن پر بھی نقد کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ روایت ان صحیح احادیث کے خلاف ہے جو (کثرت کی بنا پر) تواتر کے قریب ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ: ''امتِ محمدیہ کے کچھ لوگ ابتداءً جہنم میں داخل ہوں گے اور پھر نبی کریم ﷺ کی شفاعت سے نکالے جائیں گے''۔

بہر کیف شیخ ناصر الدین رحمۃ اللہ علیہ ''نقدِ متن'' کی طرف چنداں توجہ نہیں کرتے تھے(۱۱)، ان کا دعویٰ تھا کہ متقدمین نے ''نقدِ متن'' کے لیے کوئی منہج متعین نہیں کیا اور نہ ہی اس کے طے شدہ ضوابط ہیں، حالانکہ یہ ایک کمزور نکتہ نظر ہے، ہمارے اس موقف کی دلیل کے طور پر شیخ کی کتاب ''الإجابة فیما استدرکته عائشةؓ علی الصحابةؓ'' کافی ہے، جس کا موضوع ''نقدِ متون'' ہی ہے۔

''شذوذ'' اور ''زیادتِ ثقہ'' میں عدمِ تفریق

میرے نزدیک ایک اور قابلِ گرفت بات یہ ہے کہ شیخ ''لفظِ شاذ'' اور ''زیادتِ ثقہ'' کے درمیان فرق نہیں کرتے، اس مسئلے میں ان کا حال متاخر محدثین جیسا ہے، حالانکہ ''شذوذ'' اور ''زیادتِ ثقہ'' دونوں واضح اصطلاحات ہیں اور (محدثین کے ہاں) معروف ہے کہ ''لفظِ شاذ وہ ہے جس کو کسی شیخ کا ایک راوی اکیلا اپنے شیخ سے روایت کرے، جبکہ دیگر شاگرد اس کو نقل نہ کرتے ہوں''۔ اب اس راوی سے کہا جائے گا کہ آپ یہ لفظ کہاں سے لائے، جس کو ایک بڑی جماعت آپ کے شیخ سے روایت نہیں کرتی؟۔

ائمہ متقدمین، امامِ متقن کی ''زیادتِ ثقہ'' کو قبول کرتے تھے، نیز ''زیادتِ ثقہ'' اور ''شذوذ'' کے درمیان فرق کے قائل تھے۔ اس سلسلے میں مجھے حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث یاد آ رہی ہے، جو

بحالتِ تشہد انگشتِ شہادت کو حرکت دینے کے متعلق ہے، اس روایت میں عاصم بن کلیب سے صرف ایک راوی زائدہ بن قدامہ نے ''یحرّکھا'' کا لفظ نقل کیا ہے، عاصم کے باقی شاگرد: عبدالواحد بن زیاد، شعبہ، سفیان ثوری، زہیر بن معاویہ، سفیان بن عیینہ، سلام بن سلیم ابواحوص، بشر بن مفضل، عبداللہ بن ادریس، قیس بن ربیع، ابوعوانہ اور خالد بن عبداللہ واسطی ''یحرّکھا'' کی بجائے ''یشیر بھا'' کے الفاظ نقل کرتے ہیں، میں نے ''مسند احمد'' کی تعلیق میں ان تمام طرق کی تخریج کی ہے (۱۲)۔

شیخ ناصرؒ نے ''سلسلة الأحاديث الصحيحة'' (۱۳) میں لفظِ ''یحرّکھا'' کو ''صحیح'' قرار دینے کی علت یہ بیان کی ہے کہ: ''لفظِ اشارہ' تحریک کے منافی نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اشارہ کے الفاظ ''تحریک'' کے متعلق صریح نہ ہوں گے، لیکن منافی بھی نہیں''۔

کیا متقدمین علمائے حدیث کے منہج کے موافق اس شاذ لفظ کو ''صحیح'' قرار دینے کے لیے یہ تعلیق کافی ہے؟

اپنے مذہب کی مؤید روایات کی تصحیح اور ائمہ مجتہدین پر بے جا تنقید

بعض اوقات شیخ ایسی احادیث کی بھی تصحیح کر جاتے ہیں، جو ان کے مذاہب کے موافق ہوں، اگرچہ ان کا کوئی قوی شاہد موجود نہ ہو۔ اس سلسلے میں مجھے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی حدیث یاد آئی کہ: ''جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ آیتِ مبارکہ تلاوت کرتے ہوئے سنا: ''اِتَّخَذُوْا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' (۱۴) (انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علما اور مشائخ کو رب بنا رکھا ہے) تو حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ: ہم تو ان کی عبادت نہیں کرتے تھے؟ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: ''ہاں وہ لوگ بھی اپنے علما کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب علمائے یہود ونصاریٰ ان لوگوں کے لیے کوئی چیز حلال قرار دیتے تو وہ اسے حلال سمجھتے تھے اور جب ان پر کسی چیز کو حرام کر دیتے تو وہ اسے حرام سمجھتے تھے، یہی ان کی عبادت کرنا ہے''۔

اس حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ''جامع الترمذی'' (۱۵) میں ضعیف کہا ہے اور اس کا کوئی قوی شاہد بھی نہیں ہے، اس کے باوجود شیخ ناصر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''صحیح الترمذی'' (۱۶) میں اس کو ''صحیح'' قرار دیا ہے۔ اور ''سلسلة الأحاديث الصحيحة'' (۱۷) میں تفسیر ''روح المعانی'' (۱۸) کے حوالے سے علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے:

''والآية ناعية على كثير من الفرق الضالة الذين تركوا كتاب اللّٰه وسنة نبيه -عليه الصلاة والسلام- لكلام علماء هم ورؤساء هم، والحق أحق بالاتباع، فمتى ظهر وجب على المسلم اتباعه، وإن أخطأ اجتهاد مقلده''۔

''اس آیت میں ان گمراہ فرقوں کو مطعون کیا گیا ہے، جنہوں اپنے علما و رؤسا کی باتوں کی بنا پر خدا کی کتاب اور نبی کی سنّت سے روگردانی اختیار کر لی تھی، حالانکہ حق اتباع کا زیادہ

حقدار ہے، لہٰذا جب حق ظاہر ہو جائے تو مسلمان پر اس کی اتباع واجب ہے، اگرچہ اپنے امامِ مقلَّد کو غلط قرار دینا پڑے۔''

شیخ ناصر رحمۃ اللہ علیہ مندرجہ بالا حدیث سے استشہاد کرتے ہوئے ائمہ متبوعین پر نکتہ چینی کرتے تھے، اس موضوع پر میری ان سے گفتگو بھی ہو چکی ہے، میں نے ان سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر علما ومشائخ کو رب بنانے اور ائمہ مجتہدین (کی تقلید) میں بڑا فرق ہے، اس لیے کہ علمائے یہود ونصاریٰ تو اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو ان لوگوں کے لیے حلال قرار دیتے تھے، جبکہ یہ ائمہ اپنے اجتہادات میں کتاب وسنت پر اعتماد کرتے تھے، لہٰذا (مشہور حدیثِ مبارکہ کی بنا پر) جس کا اجتہاد درست ہو تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے اور جس سے خطاً واقع ہوئی تو اس کے لیے بھی ایک اجر ہے۔ ان ائمہ کو علمائے یہود ونصاریٰ کے برابر قرار دینا بڑی ناانصافی ہے۔

غیر واضح منہجِ تحقیق

چند چھوٹے رسائل کے علاوہ دیگر حدیثی کاوشوں میں شیخ ناصر الدین رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی واضح منہج نہیں تھا، بہت پہلے وہ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی ''**الجامع الکبیر**'' اور ''**الجامع الصغیر**'' سے ضعیف احادیث تلاش کر کے ''مکتبۂ ظاہریہ'' میں موجود ''**أجــزاء حـديثية**'' میں ان کے متعلق جو مطالعہ کرتے تھے، اسے ایک الگ کاغذ پر لکھ لیا کرتے تھے، یوں جب ان کے پاس سو یا زیادہ احادیث جمع ہو جاتیں تو ایک چھوٹے رسالہ کی صورت میں چھاپ دیتے تھے، ان میں موضوع اور باطل احادیث بھی ہوتی تھیں۔

میری دانست میں ان احادیث کو نئے سرے سے لوگوں میں پھیلانے کی چنداں ضرورت نہ تھی، اس لیے کہ وہ بھلائی جا چکی تھیں اور اہلِ زمانہ میں سے کوئی ان سے واقف نہ تھا، مثلاً: ''**علیکم بالعدس، فانه قدس علی لسان سبعین نبیًا**''۔ (دال کو لازم پکڑو، اس لیے کہ یہ ستر انبیاءؑ کی زبانی مقدّس (غذا) ہے)(۱۹) اور اس جیسی دیگر احادیث۔ شیخ نے ''**سلسلة الأحاديث الضعيفة**'' میں ایسی احادیث کو شائع کر دیا ہے، بہتر ہوتا کہ یہ موضوع احادیث نسیان کے پردوں میں ہی گم رہتیں، البتہ لوگوں کے درمیان معروف ومشہور احادیث کا حال بیان کرنے اور ان پر نقد کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس سلسلے میں ان کی محنت قابل قدر ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اسی طرح ''**سلسلة الأحاديث الصحيحة**'' میں بھی ان کا کوئی واضح منہج نہیں ہے، اس لیے کہ شیخ کو کوئی بھی صحیح حدیث ملتی تو وہ (اپنے تئیں) حدیثی نقطۂ نظر سے اس کی تحقیق کر کے اسے اس سلسلے میں درج کر لیتے تھے، ان احادیث کو جمع کرنے کا مشترک پہلو صرف یہ تھا کہ شیخ کو ان کی صحت کا اعتقاد ہے (اور ان کی تحقیق کے مطابق یہ صحیح احادیث ہیں)، میری رائے میں محض یہ بات ایک مستقل کتاب میں احادیث جمع کرنے کے لیے کافی نہ تھی، نیز (اس کتاب کی احادیث میں کسی موزوں ترتیب

کالحاظ نہیں رکھا گیا، بلکہ کیفما اتفق ذکر دی گئی ہیں) اگر وہ ان احادیث کو موضوع وار جمع کردیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔

تقسیمِ احادیث اور اسانید کا حذف

شیخ کی قابل مواخذہ باتوں میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ موصوف نے جب ''سنن اربعہ'' (سننِ ابوداؤد، سننِ ترمذی، سننِ نسائی اور سننِ ابنِ ماجہ) کی ''صحیح وضعیف'' احادیث کو جدا جدا شائع کیا تو ان کی اسانید حذف کرڈالیں، حالانکہ علمی دیانت کا تقاضہ تھا کہ وہ سندوں کو حذف نہ کرتے، اس لیے کہ ''صحیح وضعیف'' کی پہچان کا اہم مدار سند ہی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں اس طرزِ عمل سے گویا وہ لوگوں کو آمادہ کرنا چاہتے تھے کہ وہ شیخ کی تحقیق پر ہی اعتماد کریں، اور ان کی تحقیق جس حکم تک پہنچی ہے وہ حق اور ناقابلِ مناقشہ ہے۔

نیز حدیثِ صحیح وضعیف کے درمیان (شیخ کا اختیار کردہ) یہ فرق محض تکلف ہے، شاید پس پردہ ''سننِ اربعہ'' کی ضعیف احادیث کو مہمل (وناقابل استدلال) قرار دینا مقصود ہو، حالانکہ بہت سی ضعیف احادیث' احادیثِ صحیحہ کے لیے ''شواہد'' ہیں، لہٰذا ان کو صحیح احادیث سے یوں ممتاز کرنا مناسب نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنی کتابوں کی تالیف کے موقع پر خود امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی اور امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہم کے بھی قطعاً یہ عزائم نہ تھے، اس لیے کہ وہ چاہتے تو محض صحیح احادیث پر بھی اکتفا کرسکتے تھے۔ بنا بریں ''سنن'' سے متعلق شیخ ناصرالدین رحمۃ اللہ علیہ کے اس کام کو میں ان کے غیر مستحسن کاموں میں شمار کرتا ہوں۔

حکمِ حدیث کے متعلق دیگر ائمہ کے اقوال سے بے اعتنائی

ایک اور قابل گرفت بات یہ ہے کہ شیخ جب کسی ایسی حدیث کو ''صحیح'' قرار دیتے ہیں، جس کو دیگر حفاظ نے ''ضعیف'' کہا ہو تو دیگر اقوال کا تذکرہ نہیں کرتے، اگر وہ ذکر کردیتے تو لوگوں کو ان کے اور دیگر حفاظ کے احکام کے درمیان آزادانہ موازنے کی چھوٹ مل جاتی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو محض اپنے اقوال کی اتباع پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں، جو کسی طرح بھی قرینِ انصاف نہیں۔

شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی کام پر نظرِ ثانی کی ضرورت

انہی امور کی بنا پر میری دانست میں شیخ ناصرالدین البانی رحمۃ اللہ علیہ کے کام پر درج ذیل انداز سے نظر ثانی ہونی چاہیے:

۱- جن احادیث کو شیخ نے صحیح یا ضعیف قرار دیا ہے اور ان سے پہلے ائمہ متقدمین نے بھی ان کو صحیح یا ضعیف ہی کہا ہے، انہیں اپنے حال پر رہنے دیا جائے۔

۲-جن احادیث پر ائمہ متقدمین کے برخلاف شیخ نے صحت یا ضعف کا حکم لگایا ہے تو دونوں حکموں میں موازنہ کیا جائے اور دلائل وقرائن کی روشنی میں شیخ ناصر کے موافق یا مخالف حکم بیان کیا جائے۔

اپنی سابقہ بات دہراتے ہوئے میں پھر کہتا ہوں کہ شیخ ناصر الدین رحمۃ اللہ علیہ ''محدث'' تھے، میں نہیں کہتا کہ وہ ''**حافظُ العصر**'' تھے، انہوں نے اپنی زندگی کے ساٹھ برس اس علم کے پڑھنے پڑھانے میں صرف کئے ہیں اور اس طویل صحرانوردی نے ان میں فن کی بہترین مہارت ولیاقت پیدا کر دی تھی، اس لیے اس میدان میں ان کی مہارت کو کلی طور پر نظر انداز کرنا حق ناشناسی ہوگی۔

شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ کا فقہی مقام

رہا فقہی میدان تو مجھے ان کا کوئی بھی ایسا مسئلہ یاد نہیں، جس میں ان کی دلیل سے مطمئن ہوکر میں نے ان کی تحقیق قبول کر لی ہو، اس لیے کہ فقہ ان کا فن ہی نہیں، نہ ہی علمِ حدیث کی طرح فقہ میں ان کا انہماک رہا ہے، درحقیقت انہوں نے بعض علما کے شاذ مسائل لے کر ان کے ذریعے اپنے فقہی منہج کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

۱-مثال کے طور پر سامانِ تجارت میں زکوٰۃ کے عدمِ وجوب کے قول کو ہی لے لیجئے، ان سے پہلے علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ ''**المُحلّٰی**''[۲۰] میں یہ قول ذکر کر چکے ہیں۔ امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''**الدُّرَر البَھِیَّة**''[۲۱] میں اور نواب صدیق حسن رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی شرح ''**الرَّوضة النَّدِیَّة**''[۲۲] میں ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ ہی کی اتباع کی ہے۔ اور اپنے اس قول کے لیے ان کے پاس سوائے اس کے کوئی دلیل نہیں کہ سامانِ تجارت میں زکوٰۃ کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت نہیں۔

۲-زرعی پیداوار پر کن صورتوں میں زکوٰۃ واجب ہے؟ شیخ نے امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ[۲۳] کی اتباع میں ان کو صرف چار اجناس میں منحصر کر دیا ہے: ۱-گندم، ۲-جو، ۳-کھجور، ۴-کشمش۔ اس لیے کہ نص صرف ان چار اشیا کے متعلق ہے، اور دیگر اشیا کو ان پر قیاس کرنا درست نہیں۔ جبکہ جمہور فقہا سامانِ تجارت میں وجوبِ زکوٰۃ کے قائل ہیں، نیز وہ شہر کی دیگر مذکورہ اجناس اربعہ پر اشیاء خوردنی کو قیاس کرتے (ہوئے ان میں بھی زکوٰۃ کو واجب قرار دیتے) ہیں۔

مجھے تعجب ہے کہ شیخ نے یہ قول کیسے اختیار کر لیا!! حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ تاجر اپنا مملوکہ مال صندوق میں نہیں رکھا کرتا، بلکہ نقصان سے بچاؤ کے لیے ہمیشہ اسے سامانِ تجارت میں بدلتا رہتا ہے، تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ تاجر صرف اسی مال کا مالک ہے جو اس کے صندوق میں ہے، جبکہ اس کے گودام سامانِ تجارت سے اَٹے پڑے ہوں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فریضۂ زکوٰۃ کے متعلق مقاصدِ شریعت پر ان کی نگاہ کوتاہ تھی، نہ ہی وہ اسلام کے اقتصادی نظام سے واقف تھے۔

۳-انہیں شاذ اقوال میں سے ایک عورتوں پر حلقہ بنے سونے کے زیورات کو حرام قرار دینے کا قول ہے۔

اس مسئلے میں شیخ نے علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کی ''المحلّٰی''،(۲۴) کی پیروی کی ہے، چنانچہ ''سلسلة الأحاديث الصحيحة''،(۲۵) میں بزعمِ خود حرمت کے دلائل نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''کوئی مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ بات کے خلاف کسی قول کی طرف نگاہِ التفات نہیں ڈال سکتا، خواہ اس کا قائل علم وفضل اور نیکوکاری میں کیسی ہی شان کا حامل کیوں نہ ہو، اس لیے کہ بہرحال وہ معصوم تو نہیں، یہی چیز ہمارے لیے اپنے موقف پر جماؤ کا باعث ہے، (ہمارا طرزِ عمل یہ ہے کہ) کتاب وسنت کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے ان کے علاوہ کسی کا کوئی اعتبار نہ کیا جائے''۔

فہمِ حدیث میں فقہا کا منہج

شیخ کا خیال ہے کہ کسی حدیث کو صحیح قرار دینے سے مشکل حل ہوجاتی ہے، حالانکہ یہ وسعت بہت سے امور میں خلل کا باعث بن سکتی ہے۔ ائمہ متقدمین معاذ اللہ ''حدیثِ صحیح'' کے تارک ہرگز نہ تھے، بلکہ وہ ہر حدیث کو اس کا مناسب مقام دیتے تھے، مثلاً حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اِس روایت کو ہی لے لیجئے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہؓ نے یہ مطالبہ کیا کہ آپ ہماری خاطر (اشیا کی) قیمتوں کا تعیّن فرما دیجئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا کہ: ''إن اللّٰہ ھو المسعِّر القابض الباسط الرزاق''۔ (اللہ تعالیٰ ہی قیمتیں مقرر کرنے والا، (رزق میں) تنگی اور کشادگی کرنے والا ہے اور وہی رزق دینے والا ہے) اِس حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ''جامع الترمذی''،(۲۶) میں نقل کیا ہے، اس کے باوجود ائمۂ مجتہدین ''نرخ بندی'' کے قائل ہیں، ان کا کہنا ہے کہ: ''بلاشبہ یہ حدیث، حق وسچ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے، لیکن یہ ''عام مخصوص منه البعض'' کی قبیل سے ہے، انہوں نے اس حدیث کو اُس صورت کے ساتھ خاص کیا ہے جس میں بائع ومشتری کا باہمی معاملہ صلاح پر مبنی ہو اور دورِ حاضر کی طرح ان میں حرص ولالچ نہ ہو، بلاشبہ ایک ایسے معاشرے میں ''نرخ بندی'' ترک کردی جائے گی، لیکن معاشرتی تبدیلی کی صورت میں قیمتوں کا تعین ناگزیر ہے۔

شیخ محمد بخیت مطیعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی ''المجموع'' کے ''تکملة''،(۲۷) میں اس مسئلے کے متعلق علما کے مختلف اقوال جمع کردیئے ہیں۔ لیکن شیخ ناصر الدین رحمۃ اللہ علیہ ایسے امور کی طرف التفات نہیں فرماتے، ان کے نزدیک (سنداً) صحیح حدیث کی مخالفت جائز نہیں، حالانکہ ائمہ سلف بھی صحیح احادیث کے مخالف ہرگز نہیں تھے، بلکہ وہ احادیثِ رسول کو واضح فرماتے تھے اور اس سلسلے میں وظیفۂ نبوت کی پیروی کرتے تھے، (جس کا اِس آیت میں ذکر ہے) فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ''وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ''،(۲۸) ''اے پیغمبر! ہم نے تم پر بھی یہ قرآن اس لیے نازل کیا ہے، تاکہ تم لوگوں کے سامنے ان باتوں کی واضح تشریح کردو جو ان کے لیے اتاری گئی ہیں''۔ یعنی لوگوں کے سامنے مرادِ باری تعالیٰ واضح کریں، چنانچہ ائمہ مجتہدین بھی یہی وضاحت کا فریضہ ادا کرتے تھے، لیکن وہ

معصوم نہیں ہیں، خطأ وصواب دونوں ہی احتمال رکھتے ہیں، البتہ نصوص کے فہم کے لیے جو منہج انہوں نے اختیار کیا ہے، وہ شریعت کے درست فہم تک پہنچاتا ہے۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ائمہ مجتہدین نے اگر کسی حدیث کو رد کیا ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی اس کے رد کرنے والے ملیں گے اور وہ ایسی احادیث کو لیتے ہیں جس پر کسی نہ کسی صحابیؓ کا عمل ہو، مثلاً: درج ذیل حدیث کو دیکھئے: ''من مسّ ذکرہ فلیتوضأ''۔ (جس نے اپنے ذکر کو چھوا تو اسے چاہیے کہ وضو کرے) اس حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ''مسند احمد''۔ (۲۹) میں نقل کیا ہے اور (سنداً) ''صحیح'' حدیث ہے، اسی پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل ہے۔

اب ایک اور حدیث پر نظر ڈالیے: ''إنما ھو بضعۃ منک''۔ (وہ تو تیرے جسم کے گوشت کا ہی ایک ٹکڑا ہے) اس حدیث کو بھی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ''مسند احمد''۔ (۳۰) میں نقل کیا ہے اور (سنداً) یہ ''حسن'' ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اسی کو لیتے ہیں، چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ''مسِ ذکر'' ناقضِ وضو ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ناقض نہیں، اور دونوں نے اپنے مذہب کے سلسلے میں اپنے تئیں صحیح احادیث پر ہی اعتماد کیا ہے، اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمۃ اللہ علیہم میں سے بھی بعض نے ان میں سے ایک حدیث کو لیا اور بعض نے دوسری حدیث پر عمل کیا ہے۔

یہ (فقہی) اختلاف تو دورِ صحابہؓ سے چلا آرہا ہے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعریف خود اللہ تعالیٰ نے یوں فرمائی ہے: ''کُنتُم خَیرَ أُمَّۃٍ أُخرِجَت لِلنَّاسِ''۔ (۳۱) (تم وہ بہترین امّت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لیے وجود میں لائی گئی ہے) میرا اعتقاد ہے کہ یہ ''خیریت'' محض سلوک میں منحصر نہیں، بلکہ علم بھی اس کے تحت داخل ہے، اس لیے کہ سلوک کی بنیاد تو علم ہے اور وہ علم کا ہی ثمرہ ہے۔ لہٰذا اختلاف جب تک عقل وفہم کے دائرے میں رہے تو وہ تنوع کا کرشمہ اور اجتہاد وابداع کی جلوہ گاہ ہے، اسلام اس کو پسند کرتا اور اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ البتہ جب اختلاف' عقل سے قلب کی طرف سرایت کر جائے اور اس کی کوکھ سے باہمی کش مکش، سب وشتم، قطع تعلق اور کینہ وعداوت جیسے موذی باطنی امراض جنم لینے لگیں تو وہ شرعاً ممنوع ہو جاتا ہے، اسلام ایسی چیزوں کو کبھی بھی پسند نہیں کرتا۔

بعض دیگر فقہی آرا

شیخ کی بعض فقہی آرا گرد وپیش کے زمانے سے ان کی دوری کی دلیل ہیں، ان کے کئی قریبی شاگردوں کے واسطے مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ وہ حرمتِ اختلاط کی بنیاد پر کسی طالبِ علم یا طالبہ کے جامعات اور یونی ورسٹی جانے کو حرام قرار دیتے تھے، گویا اس طرح وہ یونی ورسٹیوں کو مسلمان طلبہ سے خالی کرنا چاہتے تھے۔ نیز وہ مسلمان طلبہ کے ذہنوں میں اسلام کے عمومی اصول راسخ کرنے اور اس کا منہج واضح کرنے کی بجائے بعض ایسی چیزوں کے داعی تھے، جن کے ترک سے دورِ حاضر میں کوئی خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا،

مثلاً: داڑھی چھوڑنا اور پتلون ترک کرنا، وغیرہ۔ **(حاشیہ ملاحظہ فرمائیں)**

چنانچہ جس طرح وہ اسلام کے اقتصادی نظام سے ناواقف تھے، اسی طرح اسلام کے اجتماعی ومعاشرتی نظام سے بھی نابلد تھے، بلکہ ان کے ہاں اس عظیم دین کا کوئی جامع نظریہ ہی نہیں ملتا، کیونکہ اس موضوع کو نہ تو انہوں نے پڑھا اور نہ ہی اس طرف توجہ کی ہے۔

شیخ ناصر رحمۃ اللہ علیہ کی ''سلفیت'' نصوصِ شرعیہ کے گہرے فہم کی بنیاد پر ہے، نہ امت پر طاری تقلید جامد کو توڑنے کے لیے، بلکہ یہ ''نصوص کی حرف بحرف اتباع'' ہے، جس سے (آج کے دور میں) داؤد ظاہری رحمۃ اللہ علیہ اور ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کی یادیں تازہ ہوگئیں ہیں، ایک ایسی اتباع جس میں دیگر تاویلی وجوہ کا کوئی اعتراف ہی نہیں، اس معنی کے اعتبار سے گویا ''سلفیت'' فقہی مذاہب کی وسعتوں کو مزید تنگی وتشدد پر مبنی جمود کی خاطر ترک کرنے کا نام ہے''۔

مخالفین کے ساتھ شدت آمیز رویہ

ان تمام باتوں کے باوجود میں انہیں ایک مخلص انسان سمجھتا ہوں، جس نے حصولِ جاہ ومنزلت کی بجائے محض رضائے خداوندی کی خاطر علم حاصل کیا، لیکن میں انہیں (ہر نوع کی غلطیوں سے) پاک نہیں سمجھتا، ان کے اخلاص کے پورے اعتراف کے باوجود ان کا اپنے مخالفین کے ساتھ سخت رویہ' جو اہل علم میں ہمیں نہیں دکھائی دیتا، میرے نزدیک قابلِ نقد ہے، آپ کا کسی مسئلے میں ان سے اختلاف کرنا ہی ان کے نزدیک (زبان کے نشتر لگانے کے لیے) کافی ہے، پھر وہ آپ کو ایسے اوصاف سے نوازیں گے جن سے وہ ہمیشہ اپنے مخالفین کی مدح سرائی کرتے رہتے ہیں، مثلاً جمہور فقہا کی رائے اختیار کرنے والے کو یوں یاد کرتے ہیں: ''**ھذا جمھوری**'' (یہ جمہور کا پیروکار ہے) گویا یہ کوئی عیب ہے، اسی طرح ''**ھذا لایفقه**'' (اس کو سمجھ بوجھ ہی نہیں)، ''**ھذا لیس بفنه**'' (یہ اس فن کا آدمی ہی نہیں)، ''**ھذا لیس عنده تحقیق**'' (اس شخص کے ہاں تحقیق کا کوئی گزر نہیں) اور ان کے علاوہ ایسے اوصاف کہ جن کو ایک عالم کجا، عام آدمی بھی زبان پر نہیں لاسکتا۔

(حاشیہ) زیرِ بحث مسائل کے متعلق اتنی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اسلام غیر محرم مرد وعورت کے اختلاط کو ناپسند کرتا ہے اور اس پہلو سے اسلامی احکام کا فلسفہ بالکل واضح ہے، لہٰذا دورِ حاضر میں عصری تعلیمی اداروں کا مخلوط تعلیمی نظام، اسلامی مزاج سے قطعاً موافقت نہیں رکھتا، یہ نظام بے شمار شرعی، اخلاقی معاشرتی خرابیوں کا باعث ہے، آئے دن کے احوال واقعات سے اس بات کی تصدیق ہوتی رہتی ہے، اسی بنا پر اہل علم کی اکثریت نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی ہے اور اس کی اصلاح کی تدابیر بھی تفصیلاً تحریری صورت میں آچکی ہیں، جن کی رعایت کی صورت میں ہی مشروط جواز کی گنجائش نکل سکتی ہے، البتہ اس نظام کی حوصلہ افزائی نہ کرنے کے باوجود اس کو قطعی حرام بھی نہیں کہا جاسکتا، نیز لباس کے متعلق اسلام نے جو اصولی رہنمائی کی ہے، اس کی عملی تطبیق امت میں متوارث چلی آرہی ہے، جس میں اقوامِ غیر کے ساتھ تشبّہ سے اجتناب ایک بنیادی اصول کی حیثیت سے کارفرما ہے۔ رہا داڑھی کا مسئلہ تو اس کے متعلّق نرم موقف رکھنے والے علما کے ساتھ ایک عرصے سے مباحث جاری ہیں اور جمہور اہلِ علم وجوب ہی کے قائل ہیں، بہرکیف ان مسائل میں شیخ ارنؤوط کی تعبیر وتشریح سے کلّی اتّفاق نہیں کیا جاسکتا۔

شیخ کی یہی شدت ان کے پیروؤں میں بھی سرایت کرگئی ہے، ان کی آرا کی بنا پر آئے دن مساجد میں ہونے والے جھگڑوں کا ہر ایک تذکرہ کرتا ہے کہ ان کی وجہ سے کیسے باہمی عداوتوں تک نوبت جا پہنچتی ہے!!

ہماری معلومات کے مطابق ائمہ متقدمین بھی اپنی آرا کا اظہار کرتے تھے، لیکن دیگر اہلِ علم کی آرا کا احترام بھی کرتے تھے، وہ اپنے مخالفین کے خلاف جارحانہ کلمات زبان پر نہیں لاتے تھے، ان ائمہ کا یہ جملہ سب کو یاد ہوگا، جو ان سے منقول اور مشہور ہے کہ: ''**رأيي صواب يحتمل الخطأ، ورأي غيري خطأ يحتمل الصواب**''۔ (میری رائے درست لیکن غلطی کا احتمال ہے اور دیگر آرا غلط لیکن درستگی کا امکان رکھتی ہیں) نیز امام اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا یہ جملہ بھی ہمیں یاد ہے کہ: ''**ما عبر جسر بغداد أحد أعلم من إسحاق بن راهويه ، غير أننا نخالفه في أشياء**''۔ (اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ سے بڑا عالم اس شہرِ بغداد کے پل سے نہیں گزرا، لیکن کچھ مسائل میں ہمارا ان سے اختلاف ہے)۔

شاید شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ تشدد ائمہ کبار کے بیان کردہ اس قاعدہ سے دوری کا نتیجہ ہے کہ ''**لاينكر المختلف فيه**'' (سلف کے درمیان مختلف فیہ مسئلے پر انکار نہیں کیا جائے گا) یعنی اختلافی مسائل میں کسی مجتہد پر نکیر نہیں کی جائے گی، لیکن شیخ کا رویہ اس قاعدے کے برخلاف ہے، وہ اختلافی مسائل پر بھی نکیر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔ **إنه خير مسؤل، والحمد لله رب العالمين۔**

مآخذ ومراجع

۱: ..... ملاحظہ فرمائیں:

۱-الألباني شذوذه وأخطائه لمولانا حبيب الرحمن الأعظمي، مكتبة دار العروبة كويت، ۱۴۰۴-۱۹۸۴ء۔

۲-تناقضات الألباني الواضحات فيما وقع له في تصحيح الأحاديث و تضعيفها من أخطاء وغلطات للشيخ حسن السقّاف، دار الإمام النووي عمان الأردن، ۱۴۱۳ھ-۱۹۹۲ء۔

۳-خطبة الحاجة ليست سنّة في مستهلّ الكتب والمؤلفات للشيخ عبدالفتّاح أبوغدّة رحمه الله، دار البشائر الإسلامية بيروت، ۱۴۲۹ھ، ۲۰۰۸ء۔

۴-التعريف بأوهام من قسّم السنن إلى صحيح وضعيف للشيخ محمود سعيد ممدوح، دار البحوث للدراسات الإسلاميّة وإحياء التراث دبئی، ۱۴۲۱ھ-۲۰۰۰ء۔

۵-تنبيه المسلم إلى تعدي الألباني على صحيح مسلم للشيخ محمود سعيد الموقر۔

۶- إباحة التحلّي بالذهب المحلق للنساء والردّ على الألباني في تحريمه للشيخ اسماعيل الأنصاري-رحمه الله-

۷- تصحيح حديث صلاة التراويح عشرين ركعة، والرد على الألباني في تضعيفه، للشيخ اسماعيل الأنصاري- رحمه الله -

۲: .....مشكوة المصابيح بتحقيق الشيخ الألباني، كتاب الإيمان، باب الإيمان بالقدر، ج: ۱، ص: ۳۹، رقم الحديث: ۱۱۲، المكتب الإسلامي، ۱۳۹۹ھ-۱۹۷۹ء۔

۳: .....صحيح الجامع الصغير وزيادته، ۲/۱۲۰۰، رقم الحديث: ۷۱۴۲، المكتب الإسلامي ۱۴۰۸ھ- ۱۹۸۸ء۔

۴:.....التکویر: ۸۔

۵:.....سلسلة الأحاديث الصحيحة، ۴/۴۴۷-۴۴۸، رقم الحديث: ۱۸۳۳، مكتبة المعارف رياض، ۱۴۱۵ھ-۱۹۹۵ء۔

۶:.....صحيح مسلم، كتاب صفة القيامة والجنّة والنار، باب ابتداء الخلق وخلق آدم عليه السلام، ۷/۴۴۹، رقم الحديث: ۷۰۴۹، مكتبة البشرى كراتشي۔

۷:.....التاريخ الكبير، ۱/۴۱۳-۴۱۴، دائرة المعارف العثمانية حيدرآباد دكن ۱۳۶۱ھ۔

۸:.....سلسلة الأحاديث الصحيحة، ۲/۶۴۸-۶۴۹، رقم الحديث: ۹۵۹۔

۹:.....مسندأحمد بتحقيق الشيخ شعيب الارنؤوط، رقم الحديث: ۱۹۶۷۸، مؤسّسة الرّسالة بيروت۔

۱۰:.....التاريخ الكبير، ۱/۳۸-۳۹۔

۱۱:.....یہی بات ان کے متعلق ایک اور معاصر عالم معروف محقق ومحدّث شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ رحمہ اللہ (متوفی ۱۴۲۰ھ) نے بھی لکھی ہے: ''وإنما أدى إلى هذا الشذوذ اعوجاجُ فهمه لبعض النصوص لضعف معرفته بأصول الفقه، بل أصول الرواية والدراية أيضا''. (خطبة الحاجة ليست سنّة في مستهلّ الكتب والمؤلفات، ص: ۵۲)۔ (بعض نصوص میں کج فہمی نے ان (شیخ البانی رحمہ اللہ) کو اس شذوذ تک پہنچا دیا ہے، اور اس کی وجہ اصول فقہ، بلکہ اصولِ روایت ودرایت سے واقفیت کی کمی ہے)

۱۲:.....مسندأحمد، رقم الحديث: ۱۸۸۷۰۔

۱۳:.....سلسلة الأحاديث الصحيحة، ۷/۵۵۲، رقم الحديث: ۳۱۸۱۔

۱۴:.....التوبة: ۳۱۔

۱۵:.....سنن الترمذى بتحقيق الدكتور بشارعواد معروف، أبواب تفسير القرآن، باب: ''ومن سورة التوبة'' ۵/۱۷۳، رقم الحديث: ۳۰۹۵، دار الغرب الإسلامي بيروت، ۱۹۹۸ء۔

۱۶:.....صحيح الترمذى، ۳/۵۶، رقم الحديث: ۲۴۷۱، المكتب الإسلامي ۱۴۰۸ھ-۱۹۸۸ء۔

۱۷:.....سلسلة الأحاديث الصحيحة، ۷/۸۶۶، رقم الحديث: ۳۲۹۳۔

۱۸:.....روح المعاني، تفسير قوله تعالى: ''اتخذوا أحبارهم'' (التوبة: ۱۳) ۵/ ۲۷۶، دارالكتب العلميّة بيروت ۱۴۲۶ھ-۲۰۰۵ء۔

۱۹:.....سلسلة الأحاديث الضعيفة، ۱/۵۷، رقم الحديث: ۴۰، و ۶/۲، رقم الحديث: ۵۰۱۰، المكتب الإسلامي ۱۴۰۵ھ-۱۹۸۵ء۔

۲۰:.....المحلى، كتاب الزكوة، باب أحكام التجارة، ۵/۲۳۳-۲۴۰، دار التراث القاهرة۔

۲۱:.....الدررالبهيّة، كتاب الزكاة، باب زكاة الذهب والفضّة، ص: ۲۲، مكتبة الصحابة طنطا مصر ۱۴۰۸ھ-۱۹۸۷ء۔ و السموط الذهبيّة الحاوية للدرر البهيّة للشوكاني، كتاب الزكاة، باب زكاة الذهب والفضة، ۱۰۷، مئوسّسة الرسالة بيروت ۱۴۱۰ھ-۱۹۹۰ء۔

۲۲:.....الروضة النديّة شرح الدررالبهيّة، كتاب الزكاة، باب زكاة الذهب والفضة، ۱/۲۸۶، المكتبة العصريّة بيروت ۱۴۱۸ھ-۱۹۹۷ء۔

۲۳:.....نيل الأوطارشرح منتقى الأخبار من أحاديث سيّد الأخيار، كتاب الزكوة، باب الزروع والثمار، ۴/۱۶۱، مكتبة مصطفى البابى مصر۔

۲۴:.....المحلّى، باب أحكام لبس الحرير والذهب، ۱۰/۸۴۔

۲۵:.....سلسلة الأحاديث الصحيحة، ۱/۵۹۶، رقم الحديث: ۳۳۷۔

۲۶:.....سنن الترمذى، أبواب البيوع، باب ماجاء في التسعير، ۲/۵۷۲، رقم الحديث: ۱۳۱۴۔

۲۷:.....تكملة المجموع شرح المهذب، كتاب البيوع، باب النجش، ۱۲/۱۰۹-۱۲۱، دارإحياء التراث العربى ۱۹۹۵ء۔

۲۸:.....النحل: ۴۴۔

۲۹:.....مسندأحمد، رقم الحديث: ۲۷۲۹۳۔

۳۰:.....مسندأحمد، رقم الحديث: ۱۶۲۸۶۔

۳۱:.....آل عمران: ۱۱۰۔

فریضۂ زکاۃ اور اس کی ادائیگی

مفتی محمد راشد ڈسکوی

(پہلی قسط)

اسلامی مہینوں میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ فضیلت والا مہینہ ''رمضان المبارک'' ہے۔ اس ماہِ مبارک میں مسلمانوں کو بہت ساری عبادات کے مواقع ملتے ہیں۔ یہ مہینہ شروع ہوتے ہی مسلمانوں میں ذہنی، ایمانی اور عملی اعتبار سے بہت سی خوشگوار تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں، نہ صرف یہ، بلکہ ہمارے اردگرد کے معاشرے میں امن وامان، باہمی ہمدردی اور اخوت و بھائی چارگی کی ایک عجیب فضا قائم ہوتی ہے، چنانچہ اسی مہینے میں عام طور پر اپنے اموال کی زکاۃ نکالنے کا معمول ہے، اگرچہ زکاۃ کی ادائیگی کا براہِ راست رمضان المبارک سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ زکاۃ کے وجوب اور اس کی ادائیگی کا تعلق اس کے متعین نصاب کا مالک بننے سے ہے، لیکن چونکہ رواج ہی یہ بن چکا ہے کہ رمضان المبارک میں اس کی ادائیگی کی جاتی ہے، اس لیے اس موقع پر مناسب معلوم ہوا کہ اس ماہ میں جہاں رمضان، روزہ اور ان سے متعلق ہر ہر عبادت پر لکھا جاتا ہے اور خوب لکھا جاتا ہے، وہاں اسی مہینے میں ''زکاۃ'' پر بھی لکھا جائے، تاکہ اس فریضے کے ادا کرنے والے پوری ذمہ داری سے اپنے اس فریضے کو ادا کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہنوں میں رہے کہ ہم معاشرے سے اس فضا کو ختم کرنے کی کوشش کریں جو اس وقت عمومی طور پر سارے مسلمانوں میں اپنا زور پکڑ چکی ہے کہ زکاۃ رمضان میں نکالنی ہے، بلکہ ہم یہ ماحول بنائیں اور اسی کے مطابق دوسروں کی ذہن سازی کریں کہ زکاۃ نکالنے والا اپنی زکاۃ کی ادائیگی میں زکاۃ کے واجب ہونے کے وقت کا خیال رکھتے ہوئے اس کے وقت پر زکاۃ نکالے، اور اس کے لیے رمضان کا انتظار نہ کرے۔ چنانچہ ذیل میں ''زکاۃ کن اموال پر واجب ہوتی ہے؟'' پر تفصیلاً اور کچھ دیگر مسائل پر اجمالاً روشنی ڈالی جائے گی۔

زکاۃ کا معنی ومفہوم

زکاۃ کے لغوی معنیٰ پاکی اور بڑھنے کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں ''مخصوص مال میں مخصوص

افراد کے لیے مال کی ایک متعین مقدار'' کو زکاۃ کہتے ہیں۔ (الاختیار لتعلیل المختار، کتاب الزکوٰۃ، ج:۱،ص:۹۹، دار الکتب العلمیہ)

زکوٰۃ کو زکوٰۃ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان مال کے ساتھ مشغول ہوتا ہے، تو اس کا دل مال کی طرف مائل ہو جاتا ہے، دل کے اس میلان کی وجہ سے مال کو مال کہا جاتا ہے، اور مال کے ساتھ اس مشغولیت کی وجہ سے انسان کئی روحانی و اخلاقی بیماریوں اور گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، مثلاً: مال کی بے جا محبت، حرص اور بخل وغیرہ۔ ان گناہوں سے حفاظت اور نفس و مال کی پاکی کے لیے زکوٰۃ و صدقات کو مقرر کیا گیا ہے، اس کے علاوہ زکوٰۃ سے مال میں ظاہری یا معنوی بڑھوتری اور برکت بھی ہوتی ہے، اس وجہ سے بھی زکوٰۃ کا نام زکوٰۃ رکھا گیا۔ (نوادر الأصول للترمذی، الأصل الثانی والستون والمائة فی صفة الأولیاء و حقیقة الولایة أو التحذیر من إهانتهم، ج:۲، ص:۱۴۶، دار الجیل)

زکاۃ کی فرضیت

زکاۃ اسلام کا ایک اہم ترین فریضہ ہے، اس کی فرضیت شریعت کے قطعی دلائل سے ثابت ہے، جن کا انکار کرنا کفر ہے، ایسا شخص دائرہ اسلام سے اسی طرح خارج ہو جاتا ہے جیسے نماز کا انکار کرنے والا شخص اسلام سے نکل جاتا ہے۔ زکاۃ کی فرضیت کب ہوئی؟ اس سلسلے میں بہت سی آیات اور بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زکاۃ کی فرضیت ہجرتِ مدینہ سے پہلے ہوئی، جبکہ دوسری طرف بہت سی آیات اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فرضیت ہجرت کے بعد ہوئی۔ چنانچہ اس بارے میں علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ نفسِ فرضیت تو ہجرت سے پہلے ہو گئی تھی، لیکن اس کے تفصیلی احکامات ہجرت کے بعد نازل ہوئے، ملاحظہ ہو:

''قوله: ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَأٰتُوا الزَّكَاةَ﴾ أی: أقیموا صلاتکم الواجبة علیکم و أٰتوا الزَّکَاةَ المفروضةَ. و هذا یدل لمن قال: ''إن فرض الزکاة نزل بمکة، لکن مقادیر النصب و المخرج لم تبین إلا بالمدینة''۔ (تفسیر ابن کثیر، سورۃ المزمل، آیت نمبر:۲۰)

زکاۃ کے فوائد، ثمرات و برکات

زکاۃ اللہ رب العزت کی جانب سے جاری کردہ وجوبی حکم ہے، جس کا پورا کرنا ہر صاحب نصاب مسلم پر ضروری ہے، اس فریضہ کے سرانجام دینے پر انعامات کا ملنا سو فیصد اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، کیونکہ اس فریضے کی ادائیگی تو ہم پر لازم تھی، اس کے پورا کرنے پر شاباش ملنا اور پھر اس پر بھی مستزاد، انعام کا ملنا (اور پھر انعام، دنیوی بھی اور اُخروی بھی) تو ایک زائد چیز ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ مسلمان ہونے کے ناطے اس حکم کا پورا کرنا ہر حال میں لازم تھا، چاہے کوئی حوصلہ افزائی کرے یا نہ کرے، کوئی انعام دے یا نہ دے، لیکن اس کے باوجود کوئی اس پر انعام بھی دے تو پھر کیا ہی کہنے! اور

انعام بھی ایسے کہ جن کے ہم بہرصورت محتاج ہیں، ہماری دنیوی و اُخروی بہت بڑی ضرورت ان انعامات سے وابستہ ہے، ذیل میں چند انعامات کا صرف اشارہ نقل کیا جارہا ہے، تفصیلی مباحث دیئے گئے حوالہ جات میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں:

ا: ...... زکاۃ کی ادائیگی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مال کو بڑھاتے ہیں ۔ (البقرۃ: ۲۶۷ـ تفسیر جلالین، البقرۃ: ۲۶۷ـ وروح المعانی، التوبۃ: ۱۰۴ـ صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب الصدقۃ من کسب طیب. رقم الحدیث: ۱۴۱۰، ج: ۲، ص: ۱۱۲، دار طوق النجاۃ)

۲: ...... زکاۃ کی وجہ سے اجر وثواب سات سو گنا بڑھ جاتا ہے ۔ (البقرۃ: ۲۶۱ـ تفسیر البیضاوی، البقرۃ: ۲۶۱)

۳: ...... زکاۃ کی وجہ سے ملنے والا اجر کبھی ختم ہونے والا نہیں، ہمیشہ باقی رہے گا ۔ (الفاطر: ۲۹، ۳۰)

۴: ...... اللہ تعالیٰ کی رحمت ایسے افراد (زکاۃ ادا کرنے والوں) کا مقدر بن جاتی ہے ۔ (الأعراف: ۱۵۶)

۵: ...... کامیاب ہونے والوں کی جو صفات قرآنِ پاک میں گنوائی گئیں ہیں، ان میں ایک صفت زکوٰۃ کی ادائیگی بھی ہے ۔ (المؤمنون: ۴)

۶: ...... زکاۃ ادا کرنا ایمان کی دلیل اور علامت ہے ۔ (سنن ابن ماجہ، کتاب الطھارۃ، باب الوضوء شطر الإیمان، رقم الحدیث: ۲۸۰، دار المعرفۃ بیروت)

۷: ...... قبر میں زکاۃ (اپنے ادا کرنے والے کو) عذاب سے بچاتی ہے ۔ (المصنف لابن ابی شیبۃ، کتاب الجنائز، باب فی الرجل یرفع الجنازۃ، رقم الحدیث: ۱۲۱۸۸، ج: ۷، ص: ۴۷۳، دار قرطبۃ، بیروت)

۸: ...... ایک حدیث شریف میں جنت کے داخلے کے پانچ اعمال گنوائے گئے ہیں، جن میں سے ایک زکاۃ کی ادائیگی بھی ہے ۔ (سنن أبی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب فی المحافظۃ علی وقت الصلوات، رقم الحدیث: ۴۲۹، ج: ۱، ص: ۲۱۴، دار ابن حزم)

۹: ...... انسان کے مال کی پاکی کا ذریعہ زکاۃ ہے ۔ (مسند أحمد: مسند أنس بن مالک رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث: ۱۲۳۹۴)

۱۰: ...... انسان کے گناہوں کی معافی کا بھی ذریعہ ہے ۔ (مجمع الزوائد، کتاب الزکاۃ، باب فرض الزکاۃ، ج: ۳، ص: ۶۳)

۱۱: ...... زکاۃ سے مال کی حفاظت ہوتی ہے ۔ (شعب الإیمان للبیہقی، کتاب الزکاۃ، فصل فی من أتاہ اللہ مالا من غیر مسألۃ، رقم الحدیث: ۳۵۵۷، ج: ۳، ص: ۲۸۲، دار الکتب العلمیۃ)

۱۲: ...... زکاۃ سے مال کا شر ختم ہو جاتا ہے ۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الزکاۃ، باب الدلیل علی أن من أدی فرض اللہ فی الزکاۃ، رقم الحدیث: ۷۳۷۹)

اوپر جتنے فضائل ذکر کئے گئے ہیں وہ ہر قسم کی زکاۃ سے متعلق ہیں، چاہے وہ ''زکاۃ'' سونے چاندی کی ہو، یا تجارتی سامان کی، عشر ہو یا جانوروں کی۔

زکاۃ ادا نہ کرنے کے نقصانات اور وعیدیں

فریضۂ زکاۃ کی ادائیگی پر جہاں من جانب اللہ انعامات وفوائد ہیں، وہاں اس فریضہ کی ادائیگی میں غفلت برتنے والے کے لیے قرآنِ پاک اور احادیثِ مبارکہ میں وعیدیں بھی وارد ہوئیں ہیں ، اور دنیا وآخرت میں ایسے شخص کے اوپر آنے والے وبال کا ذکر بکثرت کیا گیا ہے، ذیل میں ان میں سے کچھ ذکر کیے جاتے ہیں:

۱: ...... جو لوگ زکاۃ ادا نہیں کرتے اُن کے مال کو جہنم کی آگ میں گرم کر کے اِس سے اُن کی پیشانیوں ، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ (سورۃ التوبہ: ۳۴، ۳۵)

۲: ...... ایسے شخص کے مال کو طوق بنا کے اُس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔ (سورۃ آل عمران: ۱۸۰)

۳: ...... ایسا مال آخرت میں اُس کے کسی کام نہ آسکے گا۔ (سورۃ البقرۃ: ۲۵۴)

۴: ...... زکاۃ کا ادا نہ کرنا جہنم والے اعمال کا ذریعہ بنتا ہے۔ (سورۃ اللیل: ۵ تا ۱۱)

۵: ...... ایسے شخص کا مال قیامت والے دن ایسے زہریلے ناگ کی شکل میں آئے گا ، جس کے سر کے بال جھڑ چکے ہوں گے ، اور اس کی آنکھوں کے اوپر دو سفید نقطے ہوں گے ، پھر وہ سانپ اُس کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا ، پھر وہ اس کی دونوں باچھیں پکڑے گا (اور کاٹے گا) اور کہے گا کہ میں تیرا وہ مال ہوں ، میں تیرا جمع کیا ہوا خزانہ ہوں۔ (صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب اِثم مانع الزکاۃ، رقم الحدیث: ۱۴۰۳، ج: ۲، ص: ۱۱۰، دار طوق النجاۃ)

۶: ...... مرتے وقت ایسا شخص زکاۃ ادا کرنے کی تمنا کرے گا ، لیکن اس کے لیے سوائے حسرت کے اور کچھ نہ ہوگا۔ (سورۃ المنافقون: ۱۰۔ صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب فضل صدقۃ الشحیح الصحیح، رقم الحدیث: ۱۴۱۹، ج: ۲، ص: ۱۱۰، دار طوق النجاۃ)

۷: ...... ایسے شخص کے لیے آگ کی چٹانیں بچھائی جائیں گی ، اور اُن سے ایسے شخص کے پہلو، پیشانی اور سینہ کو داغا جائے گا۔ (صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب اِثم مانع الزکاۃ)

۸: ...... ایسے افراد کو جہنم میں ضریع ، زقوم ، گرم پتھر ، اور کانٹے دار و بدبو دار درخت کھانے پڑیں گے۔ (دلائل النبوۃ للبیہقی ، باب الإسراء، رقم الحدیث: ۶۷۹)

۹: ...... ایسے افراد سے قیامت میں حساب کتاب لینے میں بہت زیادہ سختی کی جائے گی۔ (مجمع الزوائد، کتاب الزکاۃ، باب فرض الزکاۃ: ج: ۳، ص: ۶۲)

۱۰: ...... جب لوگ زکاۃ روک لیتے ہیں تو اس کے بدلے اللہ تعالیٰ ان سے بارشیں روک لیتے ہیں۔ (المستدرک للحاکم، رقم الحدیث: ۲۵۷۷)

۱۱: ...... جب کوئی قوم زکاۃ روک لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو قحط سالی میں مبتلا کر دیتے

ہیں۔ (المعجم الأوسط للطبرانی، تحت من اسمہ عبدان، رقم الحدیث: ۴۵۷۷)

زکاۃ ادا کرنے سے مال میں کمی واقع نہیں ہوتی

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کہ میں تین چیزوں پر قسم اٹھاتا ہوں اور تمہیں ایک اہم خاص بات بتاتا ہوں، تم اسے یاد رکھنا، ارشاد فرمایا: کہ کسی بندے کا مال زکاۃ (وصدقہ) سے کم نہیں ہوتا، جس بندے پر بھی ظلم کیا جاتا ہے اور وہ اس پر صبر کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت میں اضافہ فرماتے ہیں۔ اور جو بندہ بھی سوال کا دروازہ کھولتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر فقر اور تنگ دستی کا دروازہ کھول دیتے ہیں''، یا ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کا کوئی جملہ ارشاد فرمایا''۔ اور میں تمہیں ایک اور خاص بات بتاتا ہوں، سو تم اُسے یاد رکھنا، ارشاد فرمایا: ''دنیا تو چار قسم کے افراد کے لیے ہے: ایک اس بندے کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال اور دین کا علم، دونوں نعمتیں عطا فرمائیں، تو وہ اس معاملہ میں اپنے رب سے ڈرتا ہے (اس طرح کہ اس مال کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال نہیں کرتا اور علمِ دین سے فائدہ اٹھاتا ہے) اور اس علمِ دین اور مال کی روشنی میں رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرتا ہے اور اس (مال) میں اللہ تعالیٰ کے حق کو پہچانتا ہے۔ (مثلاً: مال کو اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کرتا ہے، اور دینی علم سے دوسروں کو تبلیغ، تدریس اور افتاء وغیرہ کے ذریعے سے فائدہ پہنچاتا ہے) تو یہ شخص درجات کے اعتبار سے چاروں سے افضل ہے۔

دوسرے اس بندے کے لیے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم کی نعمت تو عطا فرمائی، لیکن مال عطا نہیں فرمایا، لیکن وہ نیت کا سچا ہے اور کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں فلاں آدمی کی طرح عمل کرتا (جو کہ رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے حق کو سمجھ کر عمل کرتا ہے) تو یہ شخص اپنی نیت کے مطابق صلہ پاتا ہے اور اس شخص کا اور اس سے پہلے شخص کا ثواب برابر ہے۔

تیسرے اس بندے کے لیے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال کی نعمت عطا فرمائی، لیکن علم کی نعمت عطا نہیں فرمائی، تو وہ علم کے بغیر اپنے مال کو خرچ کرنے میں اپنے رب سے نہیں ڈرتا، اور نہ ہی اس مال سے صلہ رحمی کرتا ہے اور نہ ہی اس مال میں اللہ تعالیٰ کے حق کو سمجھتا ہے، تو درجات میں یہ سب سے بدتر بندہ ہے۔

چوتھے اس بندے کے لیے ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے نہ تو مال کی نعمت عطا فرمائی اور نہ علم کی، تو وہ کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں بھی اس مال کے سلسلے میں فلاں بندے کی طرح عمل کرتا (جو اپنے مال کے خرچ کرنے میں اللہ سے نہیں ڈرتا اور نہ ہی صلہ رحمی کرتا ہے اور نہ ہی مال میں اللہ تعالیٰ کے حق کو سمجھتا ہے) سو یہ بندہ اپنی نیت کے مطابق صلہ پاتا ہے پس اسکا گناہ اور وبال اس پہلے شخص کے گناہ اور وبال کے مطابق ہی ہوتا ہے''۔ (سنن الترمذی، کتاب الزھد، باب ماجاء مثل الدنیا مثل أربعۃ نفر، رقم الحدیث: ۲۳۲۵، ج:۴، ص: ۵۶۲، مصطفی البابی الحلبی)

(جاری ہے)

www.banuri.edu.pk

الفاظِ طلاق سے متعلقہ اُصولوں کی تفہیم وتشریح

(آٹھویں قسط)

مفتی شعیب عالم

چودہواں فائدہ

قضاء اور دیانت

دیانت بندے اور اس کے رب کے درمیان کا معاملہ ہے، جس کا مدار نیت پر ہے۔ اس کی حقیقت قیامت کے دن آشکارا ہوگی، کسی اور کو اس میں دست اندازی کا حق نہیں ہے۔ مفتی کا اصل منصب دیانت ہی کا حکم بتانا ہے۔ جو شخص جس طرح اپنی منشا بیان اور اپنی نیت کا اظہار کرے، مفتی اسی کے مطابق اُسے حکم بتانے کا پابند ہے، چاہے وہ اپنی نیت میں سچا ہو یا جھوٹا، اس کی نیت امر واقعہ کے مطابق ہو یا مخالف۔ حقیقتِ حال کی تفتیش اور امرِ واقعہ کی تحقیق مفتی کا منصب نہیں، وہ نیت کے مطابق حکم بتا کر اصل معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے گا۔ اگر بتانے والا اپنے بیان میں سچا ہے تو اجر وثواب پائے گا اور اگر جھوٹا ہے تو مفتی کا فتویٰ اسے کوئی فائدہ نہ دے گا اور وہ خدا کے ہاں ماخوذ ہوگا۔ اس کے برعکس قضاء بندے اور بندے کے درمیان کا معاملہ ہے، جس کا تعلق ظاہر کے ساتھ ہے اور قاضی ظاہر پر عمل کا مکلّف ہے۔

''المفتی یفتی بالدیانة وا لقاضی یقضی بالظاهر۔''(۱)

مفتی اور قاضی کا یہ فرق ہے کہ مفتی کا تقرر حاکم وقت کی طرف سے نہیں ہوتا، اس لیے وہ قوتِ نافذہ بھی نہیں رکھتا۔ اگر ریاست کی طرف سے مفتی کا تقرر ہو پھر بھی مفتی کے منصب کے لیے حاکم کی طرف سے تقرری کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔ اس کے برخلاف قاضی کے لیے تقرر شرط ہے اور وہ اس بنا پر قوتِ حاکمہ بھی رکھتا ہے۔ بہرحال مفتی ہر وہ شخص ہے جو فتویٰ دے، جبکہ قاضی کے لیے تقرر شرط ہے۔

مفتی فرضی اور غیر واقعی سوال پر بھی فتویٰ دے سکتا ہے، جب کہ قضاء کی بنیاد حقیقی اور یقینی امور پر ہوتی ہے۔ قضاء کی تحدید وتخصیص ہوسکتی ہے۔ ''**القضاء یختص بزمان ومکان**'' فقہ کا مشہور مسئلہ

ہے، مثلاً: خلیفۂ وقت خود یا اگر اُس نے اختیار وزیرِ عدل یا قاضی القضاۃ کو تفویض کیا ہے تو وہ اس مفوضہ اختیار کو استعمال میں لاتے ہوئے قاضی کو پابند کرسکتا ہے کہ وہ دیوانی یا صرف فوجداری مقدمات کی سماعت کرے یا ایک خاص مالیت سے زیادہ یا سنگین نوعیت کے مقدمات کی سماعت نہ کرے یا پھر اس کا علاقائی اختیارِ سماعت محدود کرسکتا ہے، مثلاً: یہ کہ تحصیل یا ضلع کی حدود سے باہر کے مقدمات اس کی عدالت میں درج نہیں کیے جاسکتے، وغیرہ۔ اس کے علاوہ قضاء کا دائرہ فی نفسہٖ بھی محدود ہے، جب کہ فتویٰ کا دائرہ مکلّف کی پوری زندگی تک پھیلا ہوا ہے۔

اگر قرائن وآثار نیت کو جھٹلاتے ہیں تو قاضی انہیں نظر انداز نہیں کرسکتا، کیونکہ وہ اقرار، شہادت، اور ظاہری شواہد وقرائن کو زیرغور لانے کا پابند ہے، پھر اگر اس کا فیصلہ واقعہ کے مطابق ہے تو اس کی خلاف ورزی دنیا اور آخرت میں پکڑ کا باعث ہے اور اگر حقیقت حال کے خلاف ہے تو دنیا میں بہرحال اس کی خلاف ورزی قابل مؤاخذہ ہے۔

ایک معاملہ کب تک دیانت کا معاملہ رہتا ہے اور کب قضاء کی حدود میں داخل ہوجاتا ہے؟ جب تک معاملہ قاضی کی عدالت میں پیش نہ ہو وہ دیانت کے ذیل میں آتا ہے، اگرچہ پوری دنیا اس سے باخبر ہو اور جب وہ قاضی کی عدالت میں پیش ہوجاتا ہے تو وہ قضاء کی حدود میں داخل ہوجاتا ہے، اگرچہ صاحب معاملہ اور قاضی کے علاوہ کوئی اور اس پر مطلع نہ ہو۔

قضاء اور فتویٰ دونوں کا وجود مسلم ریاست اور مسلمان معاشرے کے لیے ناگزیر ہے۔ دونوں اسلامی نظام عدل کا حصہ ہیں اور اس لحاظ سے ایک ہی جڑ کی شاخیں اور ایک ہی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں، دونوں ایک دوسرے کی معاون ومددگار اور ایک دوسری کو قوت وطاقت بہم پہنچاتی ہیں۔ قضاء خالص عدالتی کارروائی ہے تو فتویٰ نیم عدالتی ہے۔ بہت حد تک دونوں کی شرائط بھی یکساں اور دائرہ بھی مشترکہ ہے، مگر اس کے باوجود یہ دونوں الگ الگ شعبے سمجھے گئے ہیں۔ نبوت کی ذات بابرکات تو تمام ہی صفات کی مالک اور ہر حیثیت کی جامع تھی۔ وحی کی ترجمانی، سلطنت کی حکمرانی، رعایا کی نگہبانی، فوجوں کی سالاری، الغرض صدہا صفات سمٹ کر ایک ہی وجود میں جمع ہوگئی تھیں۔ پیغمبر علیہ السلام کے بعد حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم میں سے بھی ہر ایک کی ذات مجموعۂ صفات اور شخصیت کئی شخصیات پر مشتمل تھی، مگر بعد میں باستثنائے ایک شخصیت کے، جامعیت اور مرکزیت کی وہ شان باقی نہ رہی، صفات بٹ کر کئی ایک میں تقسیم ہوگئیں، مناصب علیحدہ اور شعبے متفرق ہوگئے، اس وقت سے قضاء اور افتا بھی الگ ہوگئے اور اسی طرح علیحدہ چلے آرہے تھے کہ ایک وقت ایسا آیا کہ انتظامی لحاظ سے تو یہ دونوں شعبے الگ ہی رہے، مگر علمی حیثیت سے قضاء کا شعبہ فتویٰ کے تابع ہوگیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ایک مرتبہ پھر اس ابدی صداقت اور آفاقی اصول کا ظہور ہوا کہ علم غلبہ اور برتری ہے اور جہالت مغلوبیت اور محکومیت ہے۔ جب قاضیوں

www.banuri.edu.pk

میں جہالت عام ہوگئی تو اس کی تلافی مفتی کے فتوی سے کی جانے لگی۔ مفتی حکم شرعی بتادیا کرتا تھا اور قاضی اسے نافذ کردیا کرتا تھا۔ مگر قاضی کے لیے دیانت اور قضاء کا فرق سمجھنا دشوار تھا، جس کی وجہ سے یہ امکان تھا کہ کہیں وہ اپنے منصب کے برخلاف حکمِ دیانت پر فیصلہ نہ کردے، اس لیے مفتی حضرات دیانت کا حکم صرف زبانی بتادیا کرتے تھے، اس کی تحریر نہیں دیتے تھے اور اگر تحریر دیتے تو اس میں یہ صراحت کردیتے تھے کہ قاضی اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے۔ دونوں صورتوں میں مقصد یہی ہوا کرتا تھا کہ قاضی اپنی جہالت کے سبب حکمِ دیانت پر فیصلہ نہ کردے، اس طرح قضاء اور فتوی قریب آتے چلے گئے اور دھیرے دھیرے فتوی نے قضاء کی حیثیت اختیار کرلی اور آہستہ آہستہ مفتی نے قاضی کا منصب سنبھالنا شروع کردیا۔ اس کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ جب قاضی مفتی کے فتوی کے مطابق فیصلہ کرنے لگا تو مفتی نے بھی قضاء کا حکم لکھنا شروع کردیا، تاکہ قاضی اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ اس طرح قضاء کے مسائل کو شہرت بھی ملی اور وہ مدون بھی ہوئے، جبکہ دیانت کے مسائل یہ درجہ حاصل نہ کرسکے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عام کتابوں میں زیادہ تر قضاء کے مسائل درج ہیں، دیانت کے مسائل کم مذکور ہیں۔ مفتی اگر محقق نہ ہو تو وہ اسی کے مطابق فتویٰ دے دیتا ہے، اس طرح شعوری یا غیرشعوری طور پر وہ قاضی کی عمل داری میں مداخلت کرجاتا ہے۔ یہ مداخلت کسی اہمیت کے لائق نہ ہوتی، اگر قضاء اور دیانت کے احکام ہر ہر معاملے میں ایک ہوتے، مگر جب ایسا نہیں ہے تو ہر ایک کو اپنی حدود تک محدود رہنا ہی مناسب ہے:

’’لکن یکتب (المفتی) بعدہٗ و لا یصدق قضاءً لان القضاء تابع للفتوی فی زماننا لجھل القضاۃ ، فربما ظن القاضی أنه یصدق قضاءً أیضا۔‘‘(۲)

’’المراد من قولھم یدین دیانةً لا قضاءً أنه إذا استفتٰی فقیھا یجیبه علی وفق ما نوی، ولکن القاضی یحکم علیه بوفق کلامه ولا یلتفت إلی نیته إذا کان فیما نوی تخفیف .... جری العرف فی زماننا أن المفتی لا یکتب للمستفتی مایدین به بل یجیبه عنه باللسان فقط ، لئلا یحکم له القاضی لغلبة الجھل علی قضاۃ زماننا۔‘‘(۳)

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحریرات میں دونوں کے فرق اور خلط پر اپنی عادت کے موافق بڑی فاضلانہ بحث اور محققانہ تبصرہ کیا ہے۔ قضاء و افتاء میں دو تین طرح سے فرق ثابت کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

’’محقق علما نے لکھا ہے کہ مفتی قضاء کے مسئلے میں مداخلت نہ کرے۔ عام مفتی فی زماننا اس نکتہ سے ناواقف ہیں اور وہ فتوے کے ساتھ ساتھ قضاء میں بھی مداخلت کرجاتے ہیں، حالانکہ یہ جائز نہیں ہے۔ اور میں اس کی وجہ یہ سمجھتا ہوں کہ عام فقہی کتابوں میں مسائل قضاء مذکور ہیں، دیانت کے مسائل موجود کتابوں میں مہیا نہیں، ان کا اہتمام

مبسوطات میں ہے۔ عصر حاضر کے غریب مفتیوں کی وہاں تک رسائی نہیں تو وہ ان ہی مسائل کا ذکر کر دیتے ہیں جو قضاء کی فہرست میں آتے ہیں۔ اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ سلطنت عثمانیہ میں قاضی حنفی تھا اور مفتی چاروں مذاہب کے تھے، حنفی قاضی ان کے فتوے کے مطابق فیصلہ کرتا، مفتیوں نے بھی قضاء کے مسئلے لکھنا شروع کئے، تا کہ حنفی قاضی ان کی تنفیذ کرے، اس طرح قضاء کے مسئلے شائع ذائع ہو گئے اور دیانت کے مسائل عام شہرت حاصل نہ کر سکے، حالانکہ دیانت اور قضاء میں اتفاق ضروری نہیں، بلکہ کبھی دونوں کے احکام بالکل ایک دوسرے سے مخالف ہوتے ہیں۔'' (۴)

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا کلام اپنے مفہوم اور مدعا میں واضح ہے اور حاصل اس کا یہ ہے کہ مفتی اگر مختصرات اور متداولات کے ساتھ مبسوطات اور مفصلات پر نظر نہ رکھتا ہو، بالفاظ دیگر اگر اس کا مطالعہ محدود ہو اور نظر وسیع نہ ہو تو وہ ایک طرح کی ''مداخلت بے جا'' کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ دیانت کے مسائل کیوں شہرت حاصل نہ کر سکے اس کی بڑی اور اہم وجہ بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمادی ہے، اس لیے اس پر بحث کو طول دینے اور مزید تشریح اور حاشیہ آرائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تاہم اس مقام پر یہ سوال ذہن میں کھلبلاتا ہے کہ جب مفتی کا منصب دیانت پر فتویٰ دینا ہے تو پھر اہل افتاء دیانت کے مطابق فتویٰ کیوں نہیں دیتے ہیں؟ یہ سوال اس عموم کے ساتھ تو مبالغہ پر مبنی اور خلاف حقیقت معلوم ہوتا ہے، تاہم کنایات کے متعلق اس میں کوئی خاص مبالغہ محسوس نہیں ہوتا، مطبوعہ فتاویٰ جات اور مختلف دارالافتاؤں سے جاری جوابات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ یقیناً اہل افتاء اس کی کوئی معقول توجیہ پیش کریں گے اور وسعت مطالعہ رکھنے والے اہل علم کی نگاہ سے اس کا کوئی ٹھوس جواب بھی گزرا ہوگا اور وہی اس کا درست جواب ہوگا، تاہم جو وجہ فہم ناقص میں آتی ہے اور ممکن ہے کہ درست نہ ہو، وہ یہ ہے کہ دیانت کے مسائل پر فتویٰ نہ دینے کی بڑی وجہ خود معاشرے میں دیانت کی کمی اور قضاء شرعی کی عدم دستیابی ہے۔

لوگ ظاہری قرائن اور مضبوط شواہد وآثار کے برخلاف نیت بیان کرتے ہیں، بسا اوقات یہ قرائن اس حد تک مضبوط اور ناقابل تردید ہوتے ہیں کہ سب مل کر ٹھوس شہادت جیسی قوت رکھتے ہیں اور انہیں ملاحظہ کرنے کے بعد دل گواہی دیتا ہے اور کھلی آنکھوں نظر آتا ہے کہ ناقابل انکار حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اگر دیانت اس معیار کی ہوتی جس طرح کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی تو اسے بنیاد اور معیار بنانے میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہیں تھا، بلکہ عین حکم شرعی تھا، مگر جب دیانت کا وہ معیار نہیں رہا اور دوسری طرف قضاء شرعی بھی موجود نہیں ہے تو ایسے حالات میں مصلحتِ شرعی مفتی کو مداخلت پر مجبور کرتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو شریعت میں اس کے نظائر بھی موجود ہیں، مثلاً: دورِ نبوت میں اگر کوئی شخص اپنی زوجہ کو ایک

ہی مجلس میں تین مرتبہ طلاق کے الفاظ دہراتا اور اپنی نیت تاکید کی بیان کرتا تو دیانت کے برتر اور اعلیٰ معیار کے پیشِ نظر اس کی تصدیق کی جاتی تھی، مگر جب قلوب کا وہ حال نہ رہا تو دورِ فاروقی میں ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی قرار دی گئیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس پر اتفاق کیا۔ اس فیصلے کی روح وہی زمانہ کا تغیر اور دیانت کی کمی تھی۔ جس صورت میں بیوی طلاق کا مسئلہ دریافت کرتی ہے، اس صورت میں حکم قضاء پر فتویٰ دینے کی یہ توجیہ پیش کی جاسکتی ہے کہ بیوی کی حیثیت قاضی کی ہوتی ہے، گویا وہ پوچھنا چاہتی ہے کہ بحیثیت قاضی کے میرے لیے اس مسئلے میں کیا حکم ہے؟ اس لیے اسے حکمِ قضاء بتادیا جاتا ہے۔ تحکیم میں بھی قضاء کا رنگ نمایاں ہوتا ہے، اس لیے مفتی بحیثیت فیصل اور حَکَم کے حکمِ قضاء پر فیصلہ کردیتا ہے۔

بہرحال عوامل اور اسباب کچھ بھی ہوں، مفتی کا اصل منصب دیانت کا حکم بتانا ہے، اور اپنے منصب کے تقاضے کے پیشِ نظر وہ طلاق کے مسائل میں شوہر کی نیت پر فتویٰ دینے کا پابند ہے۔ ظاہری قرائن جسے طلاق کے باب میں دلالتِ حال سے تعبیر کرتے ہیں، اس پر فیصلہ مفتی نہیں، بلکہ قاضی کا منصب ہے۔

صریح سے دیانۃً عدمِ وقوع

صریح نیت کا محتاج نہیں ہوتا ہے، لیکن اگر شوہر صریح میں طلاق کے علاوہ کسی اور معنی کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا دعویٰ قابلِ قبول ہے یا نامقبول ہے؟ اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے کہ صریح کے استعمال کے وقت نیت طلاق کی ہو یا کچھ نیت نہ ہو، طلاق واقع ہوجائے گی۔ تاہم جس صورت میں شوہر طلاق کے علاوہ کچھ اور نیت بیان کرتا ہے، اس صورت میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک قضاءً تو طلاق واقع ہوجائے گی، کیوں کہ شوہر نے صریح کا استعمال کیا ہے، مگر دیانۃً واقع نہ ہوگی، کیوں کہ اس کی نیت طلاق کی نہیں تھی، صاحبِ بحر علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ کا یہی موقف ہے۔ یہ عبارت جو ایک مسلمہ اصول کی طرح کتابوں میں منقول چلی آرہی ہے کہ صریح نیت کا محتاج نہیں ہوتا ہے، یعنی ''**الصریح لا یحتاج إلی النیة**''، شیخ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد صرف قضاءً ہے، دیانۃً صریح بھی نیت کا محتاج ہے۔ صاحبِ بحرؒ کا استدلال ایک تو اس جزیے سے ہے کہ اگر شوہر نے ''**أنت طالق**'' کہا، مگر اس کی نیت نکاح کی بندش سے آزادی دینے کی نہیں، بلکہ قید سے رہائی دینے کی تھی، اسی طرح اگر وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر سبقتِ لسانی سے اس کی زبان سے ''**أنت طالق**'' نکل گیا تو دونوں صورتوں میں صرف قضاءً طلاق واقع ہوگی، دیانۃً نہ ہوگی، کیوں کہ اس کی نیت طلاق کی نہ تھی۔

صاحبِ بحرؒ کا موقف نقل کرنے کے بعد علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تردید کی ہے۔ پہلے جزیے کا جواب یہ دیا ہے کہ شوہر نے صریح کے لفظ سے طلاق کے علاوہ ایک ایسا مطلب مراد لیا ہے جس کا لفظ میں احتمال ہے اور دوسرے جزیے میں شوہر کا مقصد ہی بیوی کو طلاق دینے کا نہیں ہے، اس لیے دونوں

جزئیات سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ صریح سے دیانۃً طلاق کے وقوع کے لیے شرط ہے کہ شوہر صریح میں طلاق کے علاوہ کوئی اور معقول تاویل نہ کرتا ہو اور اس کا قصد طلاق کے لفظ سے طلاق دینے کا ہو، مگر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صریح میں طلاق کی نیت کرنا بھی شرط ہے۔

دونوں جزئیات کا جواب ذکر کرنے کے بعد علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی رائے کی تائید میں دو دلیلیں پیش کی ہیں: ایک تو یہ کہ اگر شوہر نے ''أنت طالق'' کہا اور پھر کہتا ہے کہ میری نیت بیوی کو نکاح سے آزادی دینے کی نہیں، بلکہ عمل سے آزاد کرنے کی تھی تو از روئے قضاء و دیانت دونوں طرح طلاق واقع ہو جائے گی، حالانکہ شوہر نے طلاق کے علاوہ معنی کی نیت کی تھی، اس لیے چاہیے تھا کہ طلاق واقع نہ ہوتی۔ دوسرے یہ کہ اگر شوہر نے بطور'' ہزل'' طلاق دی تو قضاءً اور دیانۃً دونوں طرح طلاق واقع ہوگی، حالانکہ ہزل (مزاح) کرنے والے کا مقصد لفظ سے اس کا مطلب نہیں ہوتا ہے۔ وہ سبب کو عمل میں لاتا ہے، مگر مسبب کا ارادہ نہیں کرتا ہے۔

فتاویٰ شامی کا متعلقہ مقام ملاحظہ کرنے کے بعد جو کچھ فہم میں آتا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ صریح سے دیانۃً طلاق کا وقوع نیت پر موقوف نہیں ہے۔ جن جزئیات میں عدم وقوع کا ذکر ہے، وہاں کوئی اور شرط مفقود ہے، مثلاً:

شوہر نے لفظ کا قصد نہیں کیا ہے۔
یا شوہر صریح زبان پر لایا ہے، مگر وہ اس لفظ کا مطلب نہیں جانتا ہے۔
یا سبقت لسانی سے صریح اس کی زبان سے نکل گیا ہے۔
یا اس نے طلاق کی اضافت بیوی کی طرف نہیں کی ہے۔
یا پھر وہ صریح کے معنی میں کوئی مناسب، معقول اور قابل قبول تاویل کرتا ہے۔

اگر درج بالا صورتوں میں سے کوئی صورت ہو تو صریح سے دیانۃً بھی طلاق واقع نہ ہوگی، مگر چونکہ اس نے صریح کا استعمال کیا ہے، اس لیے قضاءً اس کی نیت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ (۵)

صریح سے قضاءً طلاق کا عدم وقوع

دیانت پر کلام کے بعد اب ہمارے سامنے قضاء کا مسئلہ ہے کہ کن صورتوں میں صریح سے قضاءً بھی طلاق واقع نہ ہوگی۔ اس بارے میں کوئی واضح اور متعین اصول تو معلوم نہیں، تاہم ایک اصول تشکیل دیا جا سکتا ہے کہ جن صورتوں میں کسی شرط کے مفقود ہونے سے دیانۃً طلاق واقع نہ ہو، جیسا کہ پچھلے عنوان میں اس کی مثالیں گزر چکی ہیں، ان صورتوں میں اگر کوئی ایسا منفی قرینہ بھی موجود ہو جو طلاق کے عدم وقوع پر دلالت کرتا ہو تو شوہر کا قول قضاءً بھی قابلِ قبول ہوگا اور عدالت طلاق کے عدم وقوع کا حکم جاری کرے گی، مثلاً: شوہر طلاق کا لفظ استعمال کرتا ہے اور اس میں کوئی معقول اور قابل قبول تاویل

کرتا ہے، مثلاً کہتا ہے کہ میری نیت اسے نکاح سے نہیں بلکہ قید سے آزاد کرنے کی تھی تو ازروئے دیانت اس کی نیت معتبر ہے، کیونکہ لفظ میں اس کی گنجائش ہے۔اب اگر یہی لفظ اس سے جبر واکراہ کے ذریعے کہلوایا گیا ہو تو قضاءً بھی طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ جبر واکراہ عدم طلاق کا قرینہ ہے۔قاضی چونکہ ظاہر پر عمل کا مکلّف ہے، اس لیے جب خارجی ذریعے سے اس کی نیت کی تصدیق ہوگئی تو قاضی اس کے مطابق فیصلے کا پابند ہے۔اس اصول کو مزید وسعت دی جاسکتی ہے، مثلاً شوہر طلاق کا تکرار کرتا ہے اور نیت تاکید کی بیان کرتا ہے تو عنداللہ اس کی نیت مقبول ہے، کیونکہ اس کا کلام تاکید کا امکان رکھتا ہے، مگر عدالت اس کی نیت کو خاطر میں نہیں لائے گی، کیونکہ اصل عدم تاکید ہے اور شوہر کا بیان ظاہر کے خلاف ہے، لیکن اگر ظاہر سے بھی شوہر کی تصدیق ہوجائے اس طرح کہ عرف میں اس لفظ کو تاکیداً دہرانے کا رواج ہو تو عدالت بھی عدم وقوع کا حکم جاری کرے گی۔اسی طرح شوہر کا کلام صریح اضافت سے خالی ہے اور وہ طلاق کی نیت کا بھی انکار کرتا ہے تو دیانت میں طلاق واقع نہ ہوئی، اس کے ساتھ اگر کوئی قرینہ بھی ایسا نہ ہو جس سے بیوی کو طلاق دینے کا غالب ذہن بنتا ہو تو قضاءً بھی طلاق واقع نہ ہوگی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ صریح سے اگر کوئی اور مطلب اور معنی مراد لیا جائے اور صریح میں اس کا احتمال ہو تو دیانۃً طلاق واقع نہ ہوگی اور اگر اس کے ساتھ کوئی قرینہ بھی ایسا ہو جو غیر طلاق پر دلالت کرتا ہو تو قضاءً بھی طلاق نہ ہوگی۔ (۶)

کنایہ سے وقوع وعدم وقوع

کنایہ میں حل طلب سوال یہ ہوتا ہے کہ شوہر کی نیت کیا تھی؟ اس نے کس غرض اور نیت سے کنایہ کا استعمال کیا ہے؟ اگر شوہر خود اظہار کرلیتا ہے کہ اس کا ارادہ طلاق دینے کا تھا تو اس کی نیت معتبر اور اس کا بیان قابل قبول اور اس کی بیوی پر طلاق واقع سمجھی جائے گی، کیوں کہ خود شوہر سے بڑھ کر کون اس کے قول کا شارح اور نیت کا ترجمان ہوسکتا ہے؟ لفظ اس کی نیت کا ساتھ دیتا ہے اور اس تہمت کی بھی نفی ہو جاتی ہے کہ اس نے تخفیف کی غرض سے اپنی نیت طلاق کی بیان کی ہے۔اگر وہ طلاق کی نیت کا انکار کرتا ہے تو یہ بات بے غبار اور غیر اختلافی ہے کہ قاضی اس کی نیت کے مطابق نہیں، بلکہ دلالت حال کو مدنظر رکھ کر فیصلہ کرے گا، مگر مفتی دلالت حال کو زیر غور لانے کا پابند ہے یا نہیں؟ اصولی حیثیت سے دلالت حال پر فیصلہ مفتی کا منصب نہیں ہے۔ یہ سوال کہ نیت نہ ہو تو کنایہ سے عنداللہ طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ نیت نہ ہو تو ازروئے دیانت طلاق واقع نہ ہوگی، اگرچہ قرائن اور آثار وقوعِ طلاق پر دلالت کرتے ہوں:

''(قوله قضاء)قيد به لأنه لا يقع ديانةً بدون النية ، ولو وجدت دلالة الحال ، فوقوعه بواحد من النية أو دلالة الحال إنما هو في القضاء فقط

کما هو صریح البحر وغیره۔‘‘(۷)

الحاصل اگر نیت اور دلالت دونوں نہ ہوں تو نہ دیانۃً طلاق ہے نہ قضاءً۔ اگر دونوں ہوں یا صرف نیت ہوتو دونوں طرح طلاق واقع ہے۔ اگر نیت نہ ہو، مگر دلالت حال موجود ہوتو دیانۃً غیر واقع اور قضاءً واقع ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱:......الفتاوی البزازیۃ، کتاب الایمان، ج:۲،ص:۳۷۔

۲:......ردالمحتار، کتاب الحظر والاباحۃ، ج:۶،ص:۴۲۱، ط:سعید۔

۳:......تنقیح الحامدیۃ، ج:۱،ص:۳۰، ط: دارالمعرفۃ بیروت۔

۴:......حیات محدث کشمیریؒ، تالیف، حضرت مولانا انظرشاہ مسعودیؒ،ص:۴۴۲، ط: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان)

۵:......’’ولو قال لها: أنت طالق ثم قال: أردت أنها طالق من وثاق لم یصدق في القضاء.... ویصدق فیما بینه وبین اللّٰه تعالٰی لأنه نویٰ مایحتمله کلامه في الجملة۔‘‘ (بدائع الصنائع، کتاب الطلاق، کتاب الصریح، فصل الصریح، ج:۳،ص:۱۶۱، ط: داراحیاء التراث العربی)

’’مطلب في قول البحر: إن الصریح یحتاج في وقوعه دیانة إلی النیة (قوله أولم ینو شیئا) لما مر من أن الصریح لا یحتاج إلی النیة، ولکن لابد في وقوعه قضاءً ودیانةً من قصد إضافة لفظ الطلاق إلیها عالما بمعناه ولم یصرفه إلی ما یحتمله کما أفاده في الفتح، وحققه في النهر،احترازاً عما لو کرر مسائل الطلاق بحضرتها، أو کتب ناقلا من کتاب امرأتي طالق مع التلفظ، أو حکی یمین غیره فإنه لا یقع أصلا مالم یقصد زوجته، وعما لو لقنته لفظ الطلاق فتلفظ به غیر عالم بمعناه فلا یقع أصلا علی ما أفتی به مشایخ أوزجند صیانة عن التلبیس وغیرهم من الوقوع قضاءً فقط،وعمالو سبق لسانه من قول أنت حائض إلی أنت طالق فإنه لا یقع قضاءً فقط، عما لو نوی بانت طالق الطلاق من وثاق فإنه یقع قضاء فقط أیضا. وأما الهازل فیقع طلاقه قضاءً ودیانةً لأنه قصد السبب عالما بأنه سبب، فرتب الشرع حکمه علیه أراده أولم یرده کما مر، وبهٰذا ظهر عدم صحة مافي البحر والأشباه من أن قولهم إن الصریح لا یحتاج إلی النیة إنما هو في القضاء، أما في الدیانة فمحتاج إلیها أخذا من قولهم: لونوی الطلاق عن وثاق أو سبق لسانه إلی لفظ الطلاق یقع قضاءً فقط أي لا دیانة، لأنه لم ینوه، وفیه نظر، لأن عدم وقوعه دیانة في الأول لأنه صرف اللفظ إلی یحتمله، وفي الثاني لعدم قصد اللفظ، واللازم من هذا أنه یشترط في وقوعه دیانة قصد اللفظ عدم التاؤیل الصحیح.، أما اشتراط نیة الطلاق فلا بدلیل أنه لو نوی الطلاق عن العمل لا یصدق ویقع دیانة أیضا کما یأتي مع أنه لم ینو معنی الطلاق وکذا لو طلق هازلا۔‘‘ (ردالمحتار، کتاب الطلاق، باب الصریح، مطلب في قول البحر: ان الصریح یحتاج في وقوعه دیانۃ الی النیۃ، ج ۳/ ۲۵۰، ط: سعید)

۶:......’’لو نوی به الطلاق عن وثاق دین إن لم یقرنه بعدد، ولو مکرهاصدق قضاءً أیضًا (قوله صدق قضاءً) أي کمایصدق دیانة لوجود القرینة الدالة علی عدم إرادة الإیقاع وهي الإکراه۔‘‘ (المرجع السابق، ج:۳،ص:۲۵۱، ط:سعید)

’’ولو نویٰ به الطلاق عن وثاق دین (قوله دین) أي تصح نیته فیما بینه وبین اللّٰه تعالٰی لأنه نوی ما یحتمله لفظه فیفتیه المفتي بعدم الوقوع، أما القاضي فلا یصدقه، ویقضي بالوقوع لأنه خلاف الظاهر بلا قرینة۔‘‘ (ردالمحتار، کتاب الطلاق، ج:۳،ص:۲۵۱، ط:سعید)

۷:......ردالمحتار، باب الکنایات، ج:۳،ص:۲۹۷، ط:سعید

(جاری ہے)

آہ! شیخ الحدیث مولانا قاری صدرالدین رحمۃ اللہ علیہ

مولانا زبیر احمد صدیقی

مجسمۂ اخلاق، پیکرِ صداقت، عالم باعمل، شیخ التفسیر، شیخ الحدیث، شیخ الفقہ، شیخ الصرف والنحو، حضرت اقدس مولانا قاری صدرالدین طاہر مؤرخہ ۵؍رجب المرجب ۱۴۳۵ھ مطابق ۵؍مئی ۲۰۱۴ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔ مولانا قاری صدرالدین رحمۃ اللہ علیہ ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔ آپ مضبوط ترین صاحب علم، جامع المعقول والمنقول مدرس، پرجوش واعظ وخطیب، اصلاحِ خلق کا جذبہ رکھنے والے مشفق داعی، صاحب زہد وتقویٰ عالم باعمل، حافظِ قرءاتِ عشرہ، ماہر فنون، تواضع وانکساری کا مجسمہ اور اخلاق عظیمہ کے حامل مسحور کن انسان تھے۔ آپ نے ۳۲؍سال طویل عرصہ ایک ہی شہر اور ایک ہی جامعہ میں خدمت میں صرف کردیا۔ عسر ویسر، تنگی وخوشحالی میں استقامت کا دامن کبھی نہ چھوڑا۔ آخر عمر تک قرآن وسنت کی خدمت کرتے اور تفسیر وحدیث امت تک پہنچاتے واصل حق ہوگئے۔

آپ کی ولادت ۱۹۵۴ء میں ضلع لیہ کے علاقے ''جمن شاہ'' کے مضافات میں ہوئی۔ والد محترم خیر محمد علما وصلحا کے خادم اور محبّ ومحبوب تھے۔ قرآن کریم کی تعلیم اپنے ماموں اور بننے والے سسر حافظ باغ علیؒ سے حاصل کی، نیز اپنے برادر اکبر قاری غلام حسن صاحب سے بھی پڑھتے رہے۔ تکمیل قرآن کریم اور گردان جامعہ قاسم العلوم ملتان میں حضرت مولانا قاری محمد طاہر رحیمی رحمۃ اللہ علیہ سے کی، جبکہ قرءاتِ عشرہ دار العلوم کبیر والا میں قاری کریم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد اشرف شاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں۔ آپ کو قرآن کریم سے تاحیات شغف رہا، فارغ اوقات میں تلاوت کلام اللہ ان کا بہترین مشغلہ تھا۔ درسگاہ میں سبق سے فارغ ہوکر باقی ماندہ وقت تلاوت کلام اللہ میں صرف کرتے۔ گھر سے مدرسہ آتے جاتے بھی تلاوت کا معمول رہتا، سفر میں تو کئی کئی پارے تلاوت فرمالیتے۔ سفر حرمین میں گھر سے مکہ مکرمہ تک اور واپسی پر مکہ مکرمہ سے گھر تک ایک ایک ختم مکمل فرمایا۔ تقریباً چالیس برس تک اہتمام کے ساتھ تراویح سنائی۔ ضبط قرآن کریم کا یہ عالم تھا کہ رمضان المبارک کے پورے مہینے میں دوران تراویح ایک غلطی بھی نہیں آتی تھی۔

فارسی کی تعلیم کوٹ ادو میں حاصل کی۔ صرف ونحو کی تعلیم کے لیے دار العلوم کبیر والا تشریف لے

www.banuri.edu.pk

گئے۔ یہ پہلا سال تھا جب حضرت مولانا منظور الحق رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے تلمیذِ رشید حضرت مولانا محمد اشرف شاد رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا شہرۂ آفاق سبق ''ارشاد الصرف، نحو میر اور شرح مائۃ عامل'' حوالے کیا تھا۔ آپ نے اپنے استاذ محترم حضرت مولانا محمد اشرف شاد رحمۃ اللہ علیہ سے نہایت ہی محنت وعرق ریزی کے ساتھ یہ کتابیں پڑھیں۔ باقی علوم وفنون بھی دارالعلوم کبیر والا ضلع خانیوال ہی میں رہ کر اپنے شہرۂ آفاق جبالِ علم وعمل اساتذہ سے پڑھے۔ اساتذہ کرام میں حضرت مولانا مفتی علی محمد رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا منظور الحق رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا ظہور الحق رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا احسان احمد تونسوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا غلام یاسین تونسوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا عبد المجید لدھیانوی مدظلہ، حضرت مولانا محمد اشرف شاد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا مفتی عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ شامل ہیں۔ ذہانت ولیاقت کے چرچے ابھی تک آپ کے رفقا کی زبانوں پر عام ہیں۔ درجہ رابعہ سے دورۂ حدیث تک دارالعلوم کبیر والا کے شیخ الحدیث مولانا محمد ارشاد احمد کے ہم درس، ہم نوالہ وہم پیالہ اور مذاکرۂ اسباق کے ساتھی رہے۔ فراغت کے بعد ایک سال جامع مسجد غلہ منڈی خانیوال میں تدریس فرمائی، جہاں مولانا عبد الکریم حصاروی خطیب وامام تھے۔ پھر اپنے استاذ محترم مولانا محمد اشرف شاد رحمۃ اللہ علیہ کی تشکیل پر جامعہ فاروقیہ شجاع آباد تشریف لائے اور تادمِ زیست جامعہ فاروقیہ کے ہوکر رہ گئے۔

آپ ہمارے والد محترم حضرت مولانا رشید احمد رحمۃ اللہ علیہ کے رفیق خاص اور معتمد تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی مساعی سے جہاں جامعہ نے بے مثال ترقی کی، وہاں علاقے بھر میں دین کا کام بھی عام ہوا۔ آپ ۱۹۸۲ء سے ہی جامعہ فاروقیہ میں مصروف عمل ہوئے اور شہر میں ایک چھوٹی سے مسجد ''مسجد بلال'' خان گڑھ روڈ میں خطابت ودروس کے فرائض سنبھالے، آپ کی کاوشوں سے یہ مسجد عظیم جامع مسجد بن گئی۔ ایک طرف آپ کی تدریس کا ہر سو چرچا ہوا، طلبہ دور دور سے جامعہ میں آنے لگے تو دوسری جانب شہر بھر میں آپ کے مواعظ کے اثرات پہنچنے لگے، سینکڑوں لوگوں کو توبہ کی توفیق اور اپنے عقائد درست کرنے کا موقع ملا، اس سے آپ شہر کی ہر دلعزیز شخصیت بن گئے، ہر طبقۂ فکر کا آدمی آپ سے محبت کرتا اور آپ کی خدمت میں حاضری دیتا۔

آپ تدریس کے میدان کے عظیم شہسوار تھے۔ صرف ونحو میں اس قدر مہارت تھی کہ مجھ جیسے نالائق طلبہ کو بھی ہمہ قسم مشکل ترین صیغے ازبر کرادیے تھے۔ طلبہ کو صرف ونحو کی تمرین اس طرح کراتے کہ کمزور ترین طالب علم بھی لائق ترین بن جاتا۔ تفسیر قرآن کریم اور فقہ میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ نے کریما سے بخاری تک درس نظامی کی جملہ کتب کی متعدد بار تدریس فرمائی۔ اکثر دعا فرماتے کہ حق تعالیٰ خدمت حدیث کی توفیق نصیب فرمائے۔ حق تعالیٰ نے قبولیت نصیب فرمائی، چھ سال قبل بنین کا دورہ حدیث اور بارہ سال قبل بنات کا دورہ حدیث شروع ہوا، آپ کو تدریس حدیث کی خدمت کا خوب موقع ملا۔ آپ کی تدریس کی نمایاں خصوصیت طلبہ کی تربیت واصلاح تھی۔ آپ اکابر کے گرویدہ تھے اور اکابر کی علمی مہارت وتقویٰ کے واقعات آپ کو ازبر تھے۔ طلبہ کو ہمیشہ ان واقعات کے ذریعے علم وعمل پر ابھارتے تھے۔ آپ کی طلبہ پر شفقت غالب تھی، یہی وجہ ہے کہ طلبہ بھی آپ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اخلاق کا

یہ عالم تھا کہ شہر بھر میں ہر غریب امیر کے ساتھ برابر تعلق تھا۔ آپ ہر کسی کے دکھ درد کے ساتھی تھے۔ شہر میں رہائش پذیر تھے، چار مرلے کے مختصر مکان میں زندگی گزاری۔ لوگ دن رات مسائل دریافت کرنے اس چھوٹے سے گھر میں آیا کرتے تھے، رات گئے بھی جگا کر مسائل پوچھ لیتے اور آپ خندہ پیشانی سے اسی وقت ان کا مسئلہ حل فرما دیتے۔ عوامی خدمت کا یہ عالم تھا کہ شہر کے اسّی فیصد جنازے لوگ آپ ہی سے پڑھواتے اور اسے سعادت سمجھا جاتا، بایں ہمہ آپ اپنے تدریسی مشاغل میں کمی نہ آنے دیتے۔

حدیث کے ساتھ تفسیر کا اعلیٰ ذوق تھا، ۲۰۰۵ سے ۲۰۱۳ء تک برابر دورہ تفسیر پڑھاتے رہے۔ ملک بھر سے طلبہ کا ایک جم غفیر جامعہ میں تفسیر کے لیے جمع ہوتا، تقریباً ۱۰ ر پارے تفسیر کمزوری ونقاہت کے باوجود آپ خود پڑھاتے اور طلبہ کو اکابر کا ذوق منتقل فرماتے۔ فرض شناسی کا یہ عالم تھا کہ سال بھر میں ماسوائے شدید علالت کے کبھی ناغہ نہیں کیا۔ ہمیشہ سبق میں وقت سے پہلے تشریف لاتے۔ پورے جامعہ میں سب سے کم ناغے اور گھنٹوں میں سب سے کم منٹوں کی تاخیر آپ ہی کی ہوتی تھی۔ نوجوان اور مدرسہ میں مقیم اساتذہ بھی اتنی جلدی درسگاہ میں نہ پہنچتے جتنی جلدی آپ تشریف لاتے۔ جامعہ کے ساتھ خیر خواہی اور تعاون کا معاملہ بھی دیدنی تھا۔ شہر بھر سے لوگوں کو ترغیب دے کر چندہ اکٹھا کر کے خاموشی سے دفتر میں جمع کروا دیتے اور کانوں کان کسی کو خبر تک نہ ہوتی۔ طبیعت میں گریہ وزاری غالب تھی، اکثر بیان ونصیحت کرتے ہوئے آب دیدہ ہو جاتے تھے۔ اساتذۂ کرام اور ان کی اولادوں سے زندگی بھر خدمت وعقیدت کا تعلق رکھا۔

آپ ایک عرصہ سے شوگر اور بلڈ پریشر کے مریض تھے، گزشتہ ڈیڑھ دو سال سے دل کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس سال متعدد بار کارڈیالوجی ہسپتال ملتان داخل رہے۔ مؤرخہ یکم مئی مطابق یکم رجب جامعہ کی طرف سے اسباق کے اختتام کی تاریخ مقرر تھی۔ وقت مقررہ سے قبل صحیح بخاری، مشکوٰۃ المصابیح کے اسباق مکمل کیے اور ہسپتال داخل ہو گئے۔ مؤرخہ ۴ ر مئی کو چھٹی لے کر گھر پہنچے، ۵ ر مئی کو طبیعت زیادہ خراب ہو گئی، احقر فوراً حضرت کو ملتان ہسپتال لے گیا، ہسپتال پہنچتے ہی دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا، تین مرتبہ اللہ اللہ کہا اور کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے خالق حقیقی سے جا ملے۔ یہ خبر پھیلتے ہی لوگوں میں غم وصدمے کی کیفیت طاری ہو گئی، ہر آنکھ اشک بار تھی، لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔ اگلے روز جامعہ فاروقیہ میں آپ کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق بیس ہزار سے زائد افراد جنازے میں شریک ہوئے۔ شیوخ، علمائے کرام اور طلبہ کے ساتھ عوام الناس بھی بڑی تعداد میں شریک تھے۔

حسبِ وصیت خطیب پاکستان مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں میں دفن ہوئے۔ تدفین میں بھی کرامت کا ظہور ہوا، حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں میں دو قبروں کے درمیان صرف اڑھائی فٹ کا فاصلہ ہے۔ یہاں گورکن نے قبر بنائی، کھدائی کے بعد یہ قبر وسیع وعریض نظر آ رہی تھی۔ آج قبر پہ حاضری ہوئی تو عقل دنگ رہ گئی کہ اتنی مختصر جگہ میں قبر کیسے بن گئی؟ بس حق تعالیٰ نے آپ کی وصیت کی لاج رکھ لی۔ آپ نے سوگواران میں ایک بیوہ، چار بیٹے، چار بیٹیاں اور ہزاروں تلامذہ چھوڑے۔

ایک کرنسی کی دوسری کرنسی کے بدلہ خرید وفروخت اور قرض کا حکم

ادارہ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

عمر نے زید سے -/1000$ (ڈالرز) اُدھار قرضہ لیا، پاکستانی -/Rs.106 کے ریٹ سے، جبکہ اُس وقت ڈالر کا ریٹ -/Rs.100 ہے، اُدھار کی مدت دو ماہ طے ہوئی۔

یا زید نے عمر کو -/1000$ (ڈالرز) فروخت کیئے -/Rs.106 کے ریٹ سے، جبکہ اُس وقت ریٹ -/Rs.100 ہے، اب عمر نے کہا: مجھے یہ ریٹ منظور ہے، لیکن پیسے دو ماہ بعد لے لینا۔

عمر زید کو پاکستانی روپے میں رقم لوٹائے گا، تاکہ جنس بدل جائے اور ایک جنس میں کمی زیادتی نہ ہوجائے۔ اس صورت میں چونکہ رقم زیادہ تھی، اس لیے زید نے پاکستانی روپے کے چیک عمر کو دیئے۔ جب عمر نے ان پاکستانی روپے کو ڈالرز میں Convert (تبدیل) کروالیا اور ڈالرز تبدیلی کی Slip (رسید) زید کو دی، تب زید نے کہا: اب معاملہ کرلو اور لکھ بھی لو۔ سوال یہ ہے کہ:

۱- کیا کرنسی کے لین دین میں اگر مختلف کرنسی میں لین دین ہو تو کمی زیادتی جائز ہے؟ یہ بات ذہن میں رہے کہ کرنسی کے کاروبار میں ہر Exchange Company کا اپنا ریٹ ہوتا ہے۔

۲- اگر اوپر والی صورت میں لین دین ہوچکا ہو تو اب معاملہ درست کرنے کی صورت یا حل بتادیں۔ جزاک اللہ

مستفتی: محمد بن تصور خلیل، کراچی

الجواب حامدًا و مصلیًا

۱- صورتِ مسئولہ میں ایک ملک کی کرنسی کی دوسرے ملک کی کرنسی کے ساتھ خرید وفروخت کمی زیادتی کے ساتھ جائز ہے، بشرطیکہ معاملہ دونوں طرف سے ہاتھ در ہاتھ ہو، کرنسی کی خرید

وفروخت میں اُدھار جائز نہیں۔

۲-سوال کی ابتدا میں جو دوصورتیں ذکر کی گئیں ہیں وہ ناجائز ہیں، کیونکہ کرنسی کی اُدھار خرید وفروخت ناجائز ہے۔ اگراس طرح کا معاملہ کیا جاچکا ہے تو اسے ختم کرنا واجب ہے اوراس لین دین کے نتیجے میں اگرکسی فریق کوکوئی مالی فائدہ حاصل ہوا ہے تو وہ بھی واپس کرنا واجب ہے۔

یہ بھی معلوم رہے کہ اس طرح کے لین دین کو اگر چہ قرض سمجھا جاتا ہے اور سوال میں بھی اُسے قرض سے تعبیر کیا گیا ہے، مگر حقیقت میں یہ قرض نہیں، بلکہ تبادلہ ہے، یعنی خرید وفروخت کا معاملہ ہے۔

''الدرالمختار'' میں ہے:

''(وإلا) بأن لم يتجانسا (شرط التقابض) لحرمة النسأ (فلو باع) النقدين (أحدهما بالآخر جزافًا أو بفضل وتقابضا فيه) أى فى المجلس (صح و) العوضان (لايتعينان)...... (ويفسد) الصرف (بخيار الشرط والأجل) لإخلالهما بالقبض۔ وفى الشامية (قوله: لحرمة النسأ) بالفتح أى التأخير فإنه يحرم بإحدى علتى الربا: أى القدر أو الجنس...... الخ۔'' (باب الصرف، ج:۵،ص:۲۵۸-۲۵۹، ط:سعید)

اور''الدرالمختار''ہی میں ہے:

''(و) يجب (على كل واحد منهما فسخه قبل القبض) ويكون امتناعًا عنه ابن ملك (أو بعده مادام) المبيع بحاله جوهرة (فى يد المشترى إعدامًا للفساد لأنه معصية فيجب رفعها۔'' (الدرالمختار، ج:۵،ص:۹۱، ط:سعید، کراچی)

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ
ابوبکرسعیدالرحمٰن	محمدانعام الحق	شعیب عالم	محمدنقیب اللہ
			تخصص فقہ اسلامی

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

☆☆☆

نقد و نظر

ادارہ

قدیم طرز کا جدید فتنہ

مولانا سید خلیق ساجد بخاری۔ صفحات: ۴۷۔ قیمت: ۳۰ روپے۔ ناشر: منشورات قلم، دوسری منزل مسلم سنٹر، اردو بازار، لاہور۔

زیر تبصرہ رسالہ میں ''جن، جادو اور جہالت کا ایک باب'' نامی کتاب کا ''قدیم طرز کا جدید فتنہ'' کے عنوان سے پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔

اس رسالہ میں لوگوں کی راہنمائی کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ایسے نام نہاد ماہر عملیات سے خود بھی بچیں اور دوسروں کو بھی بچائیں جو جن، جادو وغیرہ کے توڑ کے نام سے لوگوں کی عزت وآبرو سے کھیلتے ہیں اور لوگوں کے مال بٹورتے ہیں۔ بہت ہی اچھا ہوتا کہ اس رسالہ میں جس موصوف کے جابجا حوالہ جات دیئے گئے ہیں، اور ان پر تنقید کی گئی ہے، ان کا نام، پتہ اور پورا تعارف بھی دیا جاتا، تاکہ قاری کو پڑھتے وقت کوئی دقت محسوس نہ ہوتی۔ امید ہے آئندہ ایڈیشن میں اس کا خیال رکھا جائے گا۔

تہوار اور تہذیب

مولانا محمد طفیل صاحب۔ صفحات: ۱۶۸۔ قیمت: درج نہیں۔ ملنے کا پتہ: معہد الایمان محمودیہ ٹاؤن یونیورسٹی روڈ، کوہاٹ۔

مولانا محمد طفیل صاحب دارالعلوم کراچی کے فاضل اور کئی ایک کتابوں اور رسائل کے مؤلف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تحریر کا عمدہ ذوق ودیعت فرمایا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں بھی آپ نے عمدہ مضامین کو جمع کیا ہے۔ اس کتاب کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں چار فصول ہیں: ا:...... تہوار اور تہذیب، ۲:...... اسلامی تہوار، فلسفہ، اثرات، امتیازات، ۳:...... اغیار کے تہواروں میں شرکت کا شرعی جائزہ، ۴:...... مغربی تہذیب، نقد و تبصرہ۔

باب دوم میں دس فصول ذکر کی ہیں: ۱:......مختلف تہذیبوں کے تہواروں پر ایک اجمالی نظر۔ ۲:...... نیوائیر نائٹ، بداعمالیوں کی سیاہ رات۔ ۳:...... ویلنٹائن ڈے.... تاریخ کیا کہتی ہے؟۔ ۴:...... بسنت ایک خونی تہوار۔ ۵:......اپریل فول ڈے ایک قبیح رسم۔ ۶:...... میراتھن.... تاریخ، ارتقا، اثرات۔ ۷:...... کرسمس ڈے اور اس کے منفی اثرات۔ ۸:......عیسوی تقویم.... تاریخ پردہ اٹھاتی ہے۔ ۹:...... کرکٹ ایک نشہ.... ایک طوفان۔ ۱۰:......اسلامی تہذیب اغیار کے نشانے پر۔

ما شاء اللہ! کتاب عمدہ انداز میں مرتب کی گئی ہے۔ نئی تہذیب اور اس کے گندے اثرات کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مفید بلکہ ضروری ہے۔

روحانی صدائیں

فقیر عبید اللہ سکھروی بلوچ۔ قیمت: درج نہیں۔ صفحات: ۱۴۶۔ ملنے کا پتہ: جامعہ انوار العلوم شکارپور روڈ، سکھر۔

زیرنظر کتاب میں مؤلف نے توحید باری تعالیٰ اور سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ مبارک میں محبت وعشق میں ڈوبی ہوئی شاعری اور تک بندی کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ موصوف اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، یہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ حضرت مولانا منظور احمد مینگل صاحب کی تقریظ بھی اس کتاب پر ثبت ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا محدثانہ مقام (دوجلدیں)

مولانا محمد نعمان، فاضل جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن۔ صفحات جلد اول: ۴۶۸، جلد دوم: ۵۳۴۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: دارالناشر، حق اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔

مولانا محمد نعمان فاضل نوجوان ہیں، جن میں مختلف کتب سے مواد لے کر یکجا کرنے کا شوق معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس طرح کی کئی کتب وہ منصۂ شہود پر لا چکے ہیں، مثلاً: تعوذ، تسمیہ اور سورۂ فاتحہ کے متعلق ۱۰۰ مباحث پر مشتمل معارف القرآن، قواعد الفقہ، قواعد التفسیر، فقہ اسلامی کے ذیلی مآخذ، وغیرہ ان کی تالیفات ہیں۔ اب زیرتبصرہ کتاب ''امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا محدثانہ مقام'' ان کی نئی تالیف ہے۔ اس کتاب میں امام ابوحنیفہؒ کی سوانح، آپ کی تابعیت، شہر کوفہ کی قدر ومنزلت، دس محدثین اساتذہ وتلامذہ کا تعارف، امام اعظمؒ کی جلالتِ شان سوا کابر اہل علم کی نظر میں، آپ کی اصول حدیث، فن حدیث اور رجال میں مہارت، کتاب الآثار کا تفصیلی تعارف، انتیس مسانید اور ان کے مصنفین کا تعارف، صحابہؓ سے روایت حدیث، محدثین کی نظر میں آپ کی بلند پایہ فقاہت کا بیان، تالیفاتِ امام اعظم، فقہ حنفی کے خصائص وامتیازات، آپ پر نقد وجرح اور اس کے تفصیلی جوابات، آپ کی ذکاوت کے پچاس دلچسپ واقعات جیسے موضوعات کو لیا گیا ہے۔

کتاب کا ٹائٹل بہت ہی عمدہ، کاغذ، طباعت اور جلد بندی میں بھی سلیقہ مندی سے کام لیا گیا ہے۔ دینی کتب میں نئے انداز سے یہ ایک نیا اضافہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے مؤلف، ناشر اور مرتبین کی محنت وسعی کو قبول فرمائے۔

تدریسِ قرآن کے رہنما اصول

مولانا قاری محمد یٰسین صاحب۔ صفحات: ۲۱۲۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: ادارہ معارف الفتح والرحیم، فیصل آباد۔ ملنے کا پتہ: مکتبۃ الرشید، سلام کتب مارکیٹ، بنوری ٹاؤن، کراچی

حضرت مولانا قاری محمد یٰسین صاحب دامت برکاتہم ان رجال کار میں سے ہیں جنہوں نے پوری زندگی قرآن کریم کی تدریس، تعلیم وتعلم اور نشر واشاعت میں گزاردی ہے، اس لیے بجا طور پر ان کو خادم القرآن کے لقب سے موسوم کیا جاتا ہے۔

زیر نظر کتاب ''تدریس قرآن کے راہنما اصول'' یہ آپ کی ان ہدایات اور ملفوظات کا مجموعہ ہے جو آپ وقتاً فوقتاً قرآن کریم کے مدرسین کو تلقین اور ارشاد فرماتے ہیں۔ اس کتاب میں حضرت موصوف قاری صاحب کے حالات، تمہیدی گزارشات، ایک مثالی مدرس قرآن کے لیے، کامیاب مدرس قرآن کے اوصاف، چند قابل اصلاح امور، تدریس قرآن، ابتدا سے فراغت تک، مشکلات کا حل، اساتذۂ فن کے سبق آموز واقعات، اپنے طلبہ کی تربیت ایسے کریں، وغیرہ عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ کتاب اس لائق ہے کہ قرآن کریم سے وابستہ مدارس اور ادارے اپنے حفظ کے اساتذہ کو اس کتاب کے پڑھنے کی ترغیب دیں، تاکہ اس شعبہ میں نکھار پیدا ہو۔

الأمثلة الخماسية على القواعد الفقهية

مولانا مفتی توفیق شاہ صاحب۔ صفحات: ۱۷۶۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: دارالناشر، حق اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور

زیر نظر مجموعہ ''الأمثلة الخماسية على القواعد الفقهية'' میں حضرت مولانا مفتی محمد توفیق صاحب نے ''الأشباه والنظائر'' سے قواعد لے کر ان کا آسان ترجمہ کرنے کے بعد ان کی توضیح وتشریح کی اور ہر قاعدے کا پانچ مثالوں سے اجرا کرایا ہے۔ فقہی ذوق رکھنے والوں کے لیے یہ خاصے کی شئے ہے۔

دروسِ ترمذی

افادات: شیخ الحدیث عارف باللہ حضرت مفتی سحبان محمود نور اللہ مرقدہٗ۔ ضبط وتحریر: حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب دامت برکاتہم، استاذ الحدیث جامعہ دارالعلوم کراچی۔ صفحات: ۴۳۱۔ قیمت: درج نہیں۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی

زیر نظر کتاب ''درسِ ترمذی'' حضرت مولانا مفتی سحبان محمود نور اللہ مرقدہٗ کے درسی افادات ہیں جو آپ نے زمانۂ دراز تک سنن ترمذی کی تدریس کے دوران بیان فرمائے، جنہیں حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب جہلمی مدظلہ نے جمع کیا ہے۔ یہ اس کتاب کی پہلی جلد ہے جو سنن ترمذی کی مبادیات سے لے کر ''باب ماجاء في البول يصيب الأرض'' تک ہے۔

اور یہ اتنے قیمتی افادات ہیں کہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم لکھتے ہیں کہ میں نے درسِ ترمذی کے دوران ان افادات سے بہت استفادہ کیا ہے۔ اس پر مولوی محمد حمزہ نے تحقیق وتخریج کا کام کیا ہے۔ بہرحال حدیث سے شغف رکھنے والے علمائے کرام اور احباب کے لیے یہ بہت ہی نایاب اور علمی خزانہ کا اضافہ ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اس کتاب کے جامع، ناشر اور مرتبین کی اس محنت عالی کو قبول فرمائے۔

سبيل الخيرات في جماعات المتنقبات (مستورات کی جماعتوں میں بھلائی کا راستہ)

مفتی رضاء الحق صاحب دامت برکاتہم۔ صفحات: ۲۸۸۔ عام قیمت: ۴۵۰ روپے۔ ناشر: زمزم پبلشرز، شاہ زیب سینٹر، نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی

دین اسلام کی ترویج واشاعت میں جس طرح مردوں کا حصہ ہے، اسی طرح عورتوں نے بھی اپنا کردار ادا کیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں عورتوں کے تبلیغ کے لیے نکلنے کے جواز کو قرآن وحدیث کی نصوص، صحابیاتؓ کے واقعات، فقہائے کرامؒ کی عبارات سے منقح کیا گیا ہے اور اس پر ہونے والے تقریباً اٹھارہ اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ نیز اس کتاب میں عورتوں کی جماعتوں کے لیے ہدایات، مقامی کام کرنے کا طریقہ، سہ روزہ، پندرہ روزہ، چلہ اور بیرون ملک جانے والی مستورات کی جماعتوں کی ترتیب اور آخر میں مستورات کی جماعتوں کی چند سبق آموز کارگزاریوں کا ذکر ہے۔ بہرحال کتاب کے کاغذ، طباعت اور جلد میں سلیقہ مندی سے کام لیا گیا ہے۔